راس نہیں مجھے اپنا چہرہ



زویا حسن

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

راس نہیں مجھے اپنا چہرہ



زویا حسن





راس نہیں مجھے اپنا چہرہ



کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم







یہ آنکھیں اسقدر اجنبی تو کبھی نہ تھیں۔ یا پھر میں کبھی بھی ان کے پانیوں کی بے چینوں کے پار دیکھ نہیں پائی۔ ان آنکھوں میں نہ تو جذبات کی گرم جوشی ہے۔ ناں نفرتوں کی سرد مہری، ناں ان میں معصومیت سانس لیتی ہے۔ اور ناں ان میں بے حیائی کی بے باکیاں ہیں اتنے سال جو میں نے ان میں خود ترسی اور بے بسی کے انبار دیکھے وہ سب فریب تھا کیا؟میں نے ان میں دن رات پنپتی ہوئی وحشت دیکھی، مظلومیت دیکھی تو کیا وہ سب پانیوں کا حصہ تھا۔ اب جو وہ پانی خشک ہوا تو میرا سارا خزانہ سارا سرمایہ ہی لٹ گیا۔میری آنکھیں بنجر ہو گئیں۔ یہ آئینہ جو میرا راز دار ہے۔ میری آنکھوں کے پانیوں سے کھیلتا رہا ہے...............

میری بے بسیوں میں میرے ساتھ روتا رہا ہے۔ آج اس میں نفرتیں کیوں ہیں میرے لئے......................

آج کیوں اس نے مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے دیوہیکل آئینے کے قریب سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اور اس کی زلفیں اس کے شانوں پر بے پرواہ آپس میں الجھ رہی تھیں۔ جسم کی تھرتھراہٹ پچھلے تین دن کی بھوک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

پیاس کی وجہ سے اس کے کمزور وجود کو اور بھی نحیف بنا رہی تھی مگر پھر اس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو سمیٹ کے بلک بلک کے رونا چاہا۔ تو وہ ایک دم فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ارے خالہ اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے جو میں نے کہہ دیا کہ اس یکم کو میں پورے نازو اہتمام سے آپ کو پورے-/2000 کا جوڑا اور ایک کلو مٹھائی کا ڈبہ دے جاؤں گی تو اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ آخر کو مجھے بھی تو بہت خوشی ہے کہ میری عزت نے پورے چھ سال اور 9 ماہ میں قرآن پاک ختم کر لیا ہے۔ ندرت بیگم کے چہرے پر فخر کے رنگ بکھرے جا رہے تھے اور خالہ بی جو ندرت بیگم سے کچھ دیر پہلے خفا خفا نظر آ رہی تھیں۔ کہ ندرت ان کو ٹرخا رہی ہیں۔ اب اپنی بڑی بیٹی کوثر کو ندرت بیگم کے لیے چائے بنانے کو کہہ رہی تھیں۔

عزت نے آج قرآن پاک ختم کیا تھا۔ ندرت بیگم کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ عزت کے والد انتظار حسین صاحب کو ساہیوال جیسے چھوٹے سے شہر میں رہتے دس سال گزر گئے تھے۔مگر عزت نے کبھی بھی اپنے گھر کسی چچا، تایا، پھپھو یا کسی خالہ اور ماموں کو نہیں دیکھا تھا۔ ندرت بیگم اس سے کہتیں کہ ہمیں کسی کی ضرورت نہیں اسی لیے ہم کسی کو اپنے گھر بلاتے ہی نہیں اور جن کو کسی کی

ضرورت نہیں ہوتی اللہ ان کو دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لے چن لیتاہے۔ عزت اب ماں کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی تھی اور انتظار حسین صاحب جو ایک لکھاری تھے۔ اپنی گہری گہری باتوں سے عزت کے دماغ میں سوالات کو جنم دے رہے تھے۔ ندرت بیگم اکثر انتظار حسین کو ٹوکتی کہ بھلا اس چھوٹی سی جان پر اس فلسفیانہ باتوں کا بوجھ ڈالنے کا کیا تک بنتا ہے۔ اور انتظار حسین بڑے دلفریب انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے میری بیٹی کو زرخیز زمین بننا ہے۔ جس پر ہر فصل اُگ جائے جیسے اردگرد کے ماحول پر زیادہ انحصار نہ کرنا پڑے جو اپنی زندگی خود کاشت کرے اپنے ڈھنگ اور اپنے رنگ سے اور پھر قہقہہ لگاتے اور بڑے گہرے انداز میں کہتے۔

"تو نہیں سمجھے گی ندرت تو نہیں سمجھے گی"

عزت اب سکول جانے لگی تھی۔ انتظار حسین کا کہنا تھا کہ بچے کے چھوٹے سے ذہن پر نصابی کتابوں کا بوجھ سات سال کی عمر تک نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ کونونٹ میں جا رہی تھی۔ پڑھائی کا خرچہ بڑھا تو ندرت نے لوگوں کے کپڑے سینے شروع کر دیئے انتظار حسین صاحب کی کتابوں سے صرف شہرت خریدی جا سکتی تھی۔ اچھے سکول کا سٹیٹس نہیں ندرت پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اور وہ خود اپنے خیالوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

میں اس قدر کھوئے رہتی کہ انہیں عزت کو پڑھانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔اس لیے عزت کو قریبی گھر میں حاجی شعیب صاحب کے گھر ٹیویشن پڑھنے کے لے بھیجا جاتا۔ حاجی صاحب نے انگلش میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔ اور قریبی سکول میں پڑھاتے تھے۔ دین کی چھاپ بہت گہری تھی اور دین کے معاملے میں عقل کو استعمال کرنے کے بہت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دین عشق ہے۔ جہاں عاشق دو کوڑی کا ہوتا ہے۔ اور دنیا والے سب مانتے ہیں کہ سیانا وہی ہوتا ہے۔ جس کے گھر میں دانے ہوں اب عاشق عقل استعمال کر کے سیانا بننا چاہے گا۔ بھی تو محبوب کے ہاں اس کی دو کوڑی کی اوقات کیا حقیقت رکھے گی اس کے گھر دانے ہیں نہیں۔عزت کو پانچ وقت کی نماز کی عادت ندرت بیگم نے ڈالی اور عشق کی راہ حاجی صاحب سکھا رہے تھے۔ مگر عزت کا دماغ حاجی صاحب کے دن بھر کے سارے احترام اور نفی کے سبق سے نکل کر رات کو کھانے کی میز پر انتظار حسین کے الجھے ہوئے اور خودی کے سبق سے ٹکراتے تووہ پریشان سی ہو جاتی۔ حاجی صاحب کہتے تھے کہ قرآن پاک کا ایک لفظ پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور دن میں کم از کم ایک سپارہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ انتظار حسین کہتے کہ بیٹا قرآن پاک کے لفظوں کو نیکیوں کے حساب کتاب سے نہ پڑھا کرو چاہے دن میں ایک

ہی آیت پڑھا کرو ساتھ اس کا ترجمہ ضرور پڑھا کرو اور اللہ کی کتاب کو ایک پیغام سمجھ کر پڑھا کرو۔ حاجی صاحب کہتے بندہ اپنی ذات میں کچھ نہیں اس کو اپنے رب کے سامنے کسی سوال جواب کی اجازت نہیں۔ انتظار حسین صاحب کہتے کہ بیٹا روز اللہ سے رات کو باتیں کر کے سویا کرو۔سارا دن وہ اکیلا بیٹھا بور ہو جاتا ہو گا۔ اس سے لڑا کرو۔ ہنسا کرو اس سے اپنی خواہشوں کے لیے سوال کیا کرو وہ کہتا ہے مجھ سے مانگو اور بار بار مانگو۔

عزت اب تیزی سے بڑی کلاسوں میں جا رہی تھی۔ اللہ نے ندرت بیگم اور انتظار حسین کو ایک ہی اولاد سے نوازا تھا۔اور ندرت بیگم کا ماننا تھا کہ اللہ میاں ان کے حالات سے با خوبی واقف ہیں۔ اس لیے مزید خرچات سے بچانا چاہتے ہیں۔ مگر انتظار حسین ایک دن پلا پلایا خرچہ گھر لے آئے حبیب اللہ۔ انتظار حسین اسے یتیم خانے سے لائے تھے۔ ندرت بیگم نے بہت شور مچایا کہ وہ ایسے بچے کو کبھی قبول نہیں کر سکتی اور انتظار حسین کو بہت بُرا بھلا کہا۔ مگر انتظار حسین نے بیگم کی ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر بیگم کو حیران کر دیا کہ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں کسی یتیم کو یتیم نہ رہنے دیتا سب کو اپنے گھر لے آتا۔ عزت کو حبیب اللہ سے چند ہی دن میں اُنسیت ہو گئی۔ وہ دس سال کا تھا۔ اور عزت اس وقت پندرہ

سال کی تھی اور ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ حبیب اللہ کو بھی سکول داخل کروا دیا گیا۔ پہلے پہل ندرت بیگم کو اس کے نام کے سوا اس میں کوئی اچھائی نظر نہ آئی مگر سکول سے واپسی پر جب وہ ندرت بیگم کو سبزی لا کر دینے لگا۔ اور عزت کو سکول چھوڑنے اور حاجی صاحب کے گھر چھوڑنے اور لانے کا کام کرنے لگا تو ندرت بیگم بھی موم پڑنے لگیں آخر کو وہ اتنی بری بھی نہ تھی۔ حبیب اللہ کو پڑھائی میں مشکل پیش آئی تو وہ بھی حاجی صاحب کے پاس جانے لگا۔ وہ اپنی کلاس میں سب سے بڑا تھا۔ حبیب اللہ کو انتظار حسین صاحب نے گورنمنٹ سکول میں داخل کروایا۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزی سکول لڑکوں کے مزاج میں صنف نازک کی خصوصیات پید اکر دیتے ہیں۔

مرد کو ہمیشہ ایک مضبوط اور اچھے بُرے حالات کا تجربہ رکھنے والا ہونا چاہیے۔ اس کے ہاتھوں میں کولڈ کریموں سے متاثر ملائمیت نہیں بلکہ مزدوروں کے ہاتھوں جیسی سختی ہونی چاہیے ان کا کہنا تھا کہ انگریزی سکول مردوں کو زندگی کی رمز نہیں سکھاتے۔ مردوں کو تحفظ مہیا کرنا نہیں سکھاتے بلکہ ان کو ایسے شخص میں ڈھال دیتے ہیں۔ جس کو پوری زندگی اپنے تحفظ کی فکر رہتی ہے۔ اور ہمارے معاشرے

کی 55٪ آبادی کو مردوں سے تحفظ چاہیے۔ کیوں کہ صنفنازک ہمیشہ مخالف ضف کا سہارا چاہتی ہے۔

عزت اب دسویں کلاس میں تھی۔ اسکا رویہ اب سکول میں بہت عجیب ہوتا وہ سب سے الگ تھلگ رہتی اور ایسا وہ شعوری طور پر نہیں کرتی تھی۔ اُس کی زندگی کے سترہ سالوں کے ملے جلے سبقوں نے اسے بہت سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ حجاب پہنتی اور بریک کے وقت انتظار حسین کی دی ہوئی کوئی کتاب پڑھتی رہتی۔ کلاس میں وہ ہمیشہ فرسٹ آتی تھی اور لیکچرز کے دوران اس کے کئے گئے سوال اساتذہ کو بہت متاثر کرتے تھے۔ مگر اس کی کلاس کی لڑکیاں اس سے حسد کرنے لگیں تھیں۔ ایک دن انگریزی کے پیریڈ میں La Belle Dams Sans Merci کا حوالہ دیا جا رہا تھا سر زبیر کہہ رہتے تھے کہ عورت ہمیشہ سے مرد کو بہکاتی آئی ہے۔ جیسے حضرت آدمؑ اور اماں حوا کے قصے سے ظاہر ہے کہ عورت برائی کی جڑ ہے۔ تو ہم یہاں بھی عورت سے کچھ اچھی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔

مرد ہمیشہ سے مظلوم رہا ہے۔ اور اس POEM میں جتنے بھی بادشاہ، شہزادے اور جنگجو آہ وزاری کر رہے ہیں۔ وہ در اصل ایک عورت کی بے وفائی کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تمام عورتوں کی خصلت کو ظاہر کرتا ہے۔ ساری کلاس ہنس رہی تھی۔

مگر عزت یکدم کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ سر اسکا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد فطری طور پر بے وقوف واقع ہوا ہے۔اسے اپنی پوری تاریخ سے کوئی سبق حاصل ن ہیں ہوا اور وہ ایک ہی غلطی بار بار دہراتا ہے۔ یا پھر وہ اخلاقی طور پر اتنا کمزور ہے کہ وہ برائی کے دہانے پہ کھڑی کسی عورت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ کہ کب کوئی عورت اس سے ٹکرائے اور کب وہ برائی کے کنویں میں گرے۔تو سردر اصل عورت اکیلی اس کائنات کے مجرموں میں شامل نہیں بلکہ مرد بھی برابر کا شریک ہے۔ ورنہ اماں حوا اکیلی ہی اپنے گناہ کی سزا بھگتتی۔ حضرت آدمؑ ہزاروں سال اپنے رب سے توبہ نہ کرتے رہتے۔ سر زبیر نے عزت کو شاباش دی اور سٹاف روم میں ان سے ملنے کا کہہ کر چلے گئے۔

وہ شرجیل احمد کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اب وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر چوم رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ کہ شرجیل احمد میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، اور ایک دفعہ پھر وہ وجود خریم کے کان

میں کچھ کہہ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ خریم ایک دم سے شرجیل احمد سے دور ہو گئی تھی اور شرجیل احمد بے یقینی کی کیفیت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

صبح شرجیل احمد معمول کے مطابق کھانا کھا کر دوکان چلا گیا۔ مہتاب بیگم نے بہت کہا کہ بیٹا کچھ دن تو کام پر مت جاؤ آخر نئی نویلی دلہن کے کچھ ارمان ہوتے ہیں۔ وہ کون پورے کرے گا۔ مگر شرجیل احمد نے ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر کہ دوکان میں آج کل بہت کام ہے۔ اور ملازم ہمیشہ مالک کی غیر موجودگی میں غفلت سے کام لیتے ہیں۔ چلا گیا۔ مہتاب بیگم کو اس دفعہ اور دھچکا لگا۔ جب کچن میں خریم کو ناشتہ بنانے میں مصروف دیکھا۔ مہتاب بیگم نے خریم کو بہت کہا کہ یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔ ابھی تم اپنی شادی کو انجوائے کرو۔ مگر خریم نے بہت پیار سے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں نہیں چاہتی ہوں کہ آپ بڑھاپے میں زیادہ کام کریں۔ آخر کو بیوی کس لیے ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی میں کام کر کے خوش ہوتی ہوں۔ مہتاب بیگم بہت حیران تھی کہ اتنی پڑھی لکھی لڑکی ایسی باتیں کر رہی ہے انہوں نے تو سنا تھا کہ پڑھنے والی لڑکیوں کو گھر کے کام کاج میں کوفت ہوتی ہے۔ اور پھر خریم نے سارے گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ صبح اٹھ کر وہ کچن میں ناشتہ اپنے ہاتھوں سے بناتی۔ پھر ملازمہ سے پورے گھر کی صفائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

کرواتی۔ برتن صاف کرواتی اور پھر مشین لگا کر اپنے شرجیل احمد اور خالہ بی کے کپڑے خود دھو دیتی۔ چھوٹی بہو اس کے بر خلاف صبح دیر سے اٹھنے کی عادی تھیں۔ اس کا سار ا کام ملازم ہی کرتے تھے۔ نبیل پچھلے ہی سال آسٹریلیا سے بزنس ایڈمسٹریشن میں ماسٹرز کر کے آیا تھا۔ اور یہاں آتے ہی اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ نازنین نبیل کی پھپھو کی بیٹی تھی۔ رشتے داری ہی کی وجہ سے یہ رشتہ ممکن ہوا تھا۔ حالانکہ نازنین نے صرف میٹرک کیا ہوا تھا۔ شکل و صورت کی اچھی تھی اور اپنے باپ کے پیسے پر خوب عیش کرتی تھی اور سسرال آکر بھی عیش میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ شرجیل اور نبیل صبح سات بجے کام پر چلے جاتے۔ شام کو نبیل چھ بجے گھر آ جاتا مگر شرجیل کو دس گیارہ بجے کام سے فرصت ملتی سارا دن خریم، نازنین اور مہتاب بیگم گھر پر مختلف کاموں میں مصروف رہتیں۔ خالہ عموماًعبادت کرنے اور پان چبانے میں مصروف نظر آئیں اور نازنین ملازموں پر رعب جھاڑنے اور ٹی وی پر کوئی سوپ دیکھنے میں ایسے میں خریم سارا دن کام میں لگی رہتی اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک گولڈ میڈلسٹ ہے۔ خالہ بی پہلے جو اس کی پڑھائی کے چرچے کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ شاید بھول چکی تھیں۔ کہ وہ شرجیل کی دلہن اور ان کی بڑی بہو ہونے کے علاوہ بھی کوئی ہنر

رکھتی ہے۔ وہ مطمئن تھیں کہ ان کی بڑی بہو نے گھر کا سارا انتظام بہت مہارت سے سنبھال رکھا ہے۔

پہلی رات کے بعد شرجیل احمد کو کبھی فرصت ہی نہ ملی کہ وہ خریم سے محبتوں کی صداقت کے ثبوت اکھٹے کرتا۔وہ رات کو تھکا ہوا آتا تو خریم اس کو کھانا دیتی اور پھر باہر کے کرنے کا کوئی کام ہوتا تو وہ بتا دیتی جسے بجلی گیس یا فون کا بل ہوتا یا سودا سلف لانا ہوتا ہاں اتوار کو شرجیل اسے شاپنگ کروانے اپنے ساتھ لے جاتا۔ زندگی شرجیل کی نظر میں بہت پر سکون گزر رہی تھی۔ خریم کے پڑھے لکھے ہونے کا جو خوف اس کے دل میں تھا خریم کے عجز نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ وہ بالکل ایک گھریلوعورت بن گئی تھی جیسے شرجیل احمد سے مہینے بھر میں استعمال ہونے والے سوداسلف کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اور شرجیل احمد خوش تھا۔ کہ خریم نے کبھی اس سے زیادہ اس سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ خالہ بی زیادہ عورتوں کو اپنے گھر میں نہیں آنے دیتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ باہر کی عورتیں اندرونی ماحول کو خراب کر دیتی ہیں۔ مگر ایک دن جب وہ وظیفہ کرنے میں مصروف تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد تو خریم ان کے پاس آ بیٹھی اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد خریم نے خالہ بی سے کپڑوں کی سلائی سیکھنے کا ذکر کیا تو خالہ بی جھٹ سے

مان گئیں اگلے ہی روز ایک خاتون خریم کو کپڑے سلائی سکھانے گھر پہنچ گئی تھی۔ خریم کو جیسے بہت بڑی خوشی مل گئی تھی۔ اب وہ کام کاج کے بعد برکت بی بی سے کپڑے سلائی کرنا سیکھتی اور ساتھ ساتھ زبان پر لگے زنگ کو بھی آہستہ آہستہ اتارتی جا رہی تھی۔ اس گھر میں آکر خریم تو جیسے سب بولنا، چلنا، اٹھنا، بیٹھنا سب بھول گئی تھی برکت بی بی بہت باتونی واقع ہوئی تھیں۔ شروع شروع میں وہ خریم کو اپنی باتیں ہی سناتیں رہتیں۔ آہستہ آہستہ خریم کو ان کی عادت ہو گئی تو وہ خود بھی باتیں کرنے لگی تھی۔ ایک دن برکت بی بی نے خریم سے پوچھا کہ تمہارے میاں کیا کرتے ہیں بیٹی تو خریم کے جواب سے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ " وہ چکی چلا رہے ہیں دن سے رات اور رات سے دن تمہیں پتا ہے برکت بی بی ان کے دانے پستے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اور میں چاہتی ہوں وہ ہمیشہ چکی پیستے رہیں ہمیشہ " ہا ہا ہا .... ہاہاہا " برکت بی بی حیران آنکھوں سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھتی رہیں شاید وہ اس گھر میں خریم کے آنے کے بعد پہلی خاتون تھیں۔ جنھوں نے اس کے سراپے کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایک دراز قد گورے رنگ کی حسین لڑکی تھی۔ جس کا چہرہ ہنستے ہوئے بہت سرخ ہو جاتا

تھا۔ لمبے سیاہ بال تھے۔ چہرے پر آنکھیں نمایاں ہوتیں تھیں ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو گہرے رنگ تیرتا تھا وہ حسین کتھاؤں کا راز دار تھا۔

برکت بی بی شاید اپنی جوانی میں ایسے سب رازوں سے واقف رہیں تھیں۔ اس لیے وہ ایک جھلک میں لوگوں کے دلوں میں پڑی گرہوں کو پہنچاننے اور پھر دھیرے دھیرے آہستہ ہاتھوں سے انہیں کھولنے کی ماہر تھی۔ وہ ان عورتوں میں شامل تھی جو ایک دلال مرد کی طرح ہیرے اور سچے موتیوں کو پرکھنے میں ماہر ہوتے ہیں وہ جوان بدنوں میں موجود لچک کو بغیر چھوئے اپنی آنکھوں سے ماپ لیتی تھیں۔ وہ اس قدر غیر معمولی جواب سن کر تھوڑی دیر چپ رہی اور پھر اچانک اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی خریم نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی کہ اسے برکت بی بی کے اس قدر نزدیک ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ اس وقت ٹھٹکی جب برکت بی بی اس کے کان کے قریب منہ لا کر کہہ رہی تھیں۔ ”خریم بیٹا چکی تو سب چلا رہے ہیں۔ تم بھی میں بھی اور شرجیل بھی اور اس کائنات کی ساری مخلوق“ خریم کو جیسے ایک دم سے کرنٹ لگ گیا تھا وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر برکت بی بی نے جھٹ سے اس کا راستہ روک ڈالا اب وہ بہت گہری نظروں سے خریم کو ٹٹولنے میں مصروف تھیں اور پھر آہستگی سے سرگوشی کی سی آواز میں گویا ہوئیں

میں تمہارے اس راز کو راز ہی رکھوں گی۔ خریم بیٹا اور یہ کہتی ہوئیں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

شرجیل اور خریم کی شادی کو دوسال ہونے کو تھے۔ مگر مہتاب بیگم جو کب سے آس لگائے بیٹھی تھیں۔ پوتے پوتی کی کوئی خوشی نہیں ملی تو ایک دن انہوں نے کھلے انداز میں شرجیل احمد سے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا انہیں کہاں معلوم تھا کہ شرجیل احمد اور خریم کے درمیان کچھ ایسا نا تھا جو ایسا کچھ ممکن ہوتا انہوں نے شرجیل احمد سے کہہ دیا کہ اگر ایسا کچھ جلد نا ہوا تو وہ شرجیل احمد کا بیاہ کسی اور سے کر دیں گی۔ وہ شاید سمجھ رہیں تھیں کہ خریم میں کچھ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی تک کسی خوشی سے محروم تھے۔

ماں کی بات سن کر شرجیل احمد پریشان ہو گیا تھا۔ دو تین دن وہ کسی سوچ میں الجھا رہا۔ اور پھر ایک رات دوکان سے واپسی پر اس نے اپنی ماں کی خواہش خریم کے آگے رکھ دی۔ خریم اس وقت ڈائینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہاتھوں پر کولڈ کریم لگا رہی تھی شرجیل کی بات سن کر ایک ثانیے کے لیے اس کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ مگر جب وہ جواب میں خاموش رہی تو شرجیل احمد پھر سے گویا ہو ا وہ اب بیڈ سے اٹھ کر خریم کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ خریم کے

تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ خریم کے کاندھے پر رکھ دیا اور کچھ ثانیے کو جیسے خریم کے بدن سے جان ہی نکل گئی تھی۔ جب وہ گویا ہوا " میرا خیال ہے ہمیں امی کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے " اب وہ اس کے نازک سر د پڑتے وجود پر جھک رہا تھا جب خریم کو ایک تیسرے وجود کی موجودگی کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس مسکراہٹ میں آشنائی اور قربت کے بہت سے احساس پنہاں تھے۔ خریم جیسے شرجیل احمد کی موجودگی کو یکسر بھول گئی تھی اور اس تیسرے وجود میں گم ہو گئی تھی وہ اس وجود میں فنا ہو جاتی اگر شرجیل احمد اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھتے ہوئے اس سے الگ نہ ہوتا۔ اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

خریم فنا کی دہلیز تک پہنچ جاتی جب شرجیل احمد اس کے ٹھنڈے پڑتے وجود کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر دیتا۔

برکت بی بی اب خریم کے سارے رازوں سے واقف ہو گئی تھی۔ خریم گھنٹوں بیٹھی ایک کے بعد ایک گرہیں کھولتی جا رہی تھی۔ اور برکت بی بی جو پہلے اپنی کہتے نہ تھکتی تھی۔ چپ چاپ اس کو سنتی رہتیں۔

مہتاب بیگم حیران ہوتیں کہ جو لڑکی دو سال میں کبھی بھی اونچی آواز میں بات نہ کر سکی وہ اس گھر میں برکت بی بی کے ساتھ پہروں کیا باتیں کرتی رہتی ہے۔ مگر اُنہوں نے زیادہ جاننے کی کوشش نہ کی۔ اور پھر ایک دن جب شرجیل احمد نے ان کو خریم کے بارے میں اچھی امید کی خبر سنائی تو وہ تو جیسے خوشی سے ناچ اٹھیں انہوں نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی۔ اور اب ہر دوسرے روز گھر میں قرآن خوانی کروائی جا رہی تھی۔ ان دو سالوں میں خریم کے میکے سے کوئی نہ آیا تھا۔میکے میں تھا بھی کون ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور ایک بھائی تھا جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کراچی رہتا تھا۔مہتاب بیگم اس کا خیال ماؤں جیسا رکھ رہی تھیں۔ پہلے تین مہینوں میں تو خریم کو مہتاب بیگم نے بیڈ سے پاؤں نیچے نہ اتارنے دیا اور پھر جب ایک دن برکت بی بی آئی تو مہتاب بیگم کے لاکھ منع کرنے کے باوجود خریم نے پھر سے سلائی کا کام شروع کر دیا۔ ایک دن اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد برکت بی بی نے خریم سے جو سوال کیا اس نے خریم کو پریشان کر دیا وہ کہہ رہی تھیں۔ " خریم کیا تم اس بچے سے خوش ہو " خریم گم صُم بیٹھی رہی اور پھر کچھ کھوئے ہوئے انداز میں بولی " برکت بی بی میں سمجھتی تھی میں گناہ کی دنیا سے نکل آئی ہوں مجھے لگتا تھا۔ شرجیل احمد جیسے نیک شخص سے جو پانچ وقت نماز پڑھتا

ہے۔ اور تہجد کے وقت اللہ کے آگے روتا ہے شادی کرکے میں پاک صاف ہو جاؤں گی۔ میرے وجود کی ساری گندگی دُھل جائے گی مگر شاید میں غلط تھی۔ شرجیل احمد کے پاک وجود نے کبھی مجھے اپنے وجود کا حصہ نہیں مانا۔ اس کی پاکیزگی کبھی میری روح کا حصہ نہ بن سکی اور میں ناپاک ہی رہی۔ اب جب وہ مجھے اپنے وجود کی ایک پرچھائی دینا چاہتا ہے۔تو مجھے لگتا ہے۔ کہ میں اس قابل نہیں اور شرجیل احمد کا پاک وجود مجھ جیسی غلاظت سے گندگی کے سوا کچھ نہیں پائے گا۔ ہماری اوالاد ناجائز ہو گی۔ برکت بی بی اور مجھے اپنے اور شرجیل کے درمیان اس نئے رشتے میں ناپاکی کی بُو آتی ہے۔ یہ سب ناجائز ہے۔ برکت بی بی یہ سب ناجائز ہے۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

برکت بی بی بہت دیر تک اس کو اپنے سینے سے لگائے اس کے زخموں کی آواز اپنے سینے میں اتارتی رہی اور پھر جب خریم آہستگی سے اس سے الگ ہو گئی تو وہ ایک دفعہ پھر اس کے زخموں کو اپنے تجربے کے تیز دھار چاقو سے ٹٹولنے لگی۔ اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ " مگر خریم تمہارا میاں تو چکی چلا رہا ہے۔ اور تم چاہتی ہو کہ وہ ہمیشہ چکی چلاتا ہے۔ اس کے دانے کبھی کم نہ ہوں اور ....

اور جہاں تک مجھے تمہاری باتوں اور سراپے سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ غلط نہیں ہو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

سکتا کہ تمہیں شرجیل احمد سے نفرت ہے۔ تو پھر اب تم اس کو پاک اور نیک روح کیوں کہہ رہی ہو۔ خریم اب دوزانوں بیٹھی تھی۔ اور اس کے بال اس کے چہرے کو دونوں طرف سے چھپا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر کچھ بھی ایسا نہ تھا جو زندگی کے وجود کو ظاہر کرتا ہو۔ بات کرتے کرتے جب برکت بی بی کی نظر اس پر پڑی تو وہ ایک دم سے ڈر گئی وہ فوراً ہی وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئی وہ آج بیرونی گیٹ کے ساتھ موجود لان میں بیٹھی تھیں۔ جہاں بہت سے پودے تھے اور درخت تھے۔ مگر خزاں کی وجہ سے سارا لان پیلے اور زرد پتیوں سے بھرا پڑا تھا۔ آج خریم نے لان کی صفائی نہیں کروائی تھی۔ شاید انگوروں کی ایک بڑی بیل بیرونی دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔

جس پر بہت سی چونٹیاں اور کیڑے مکوڑے بیل کی سوکھی اور خشک شاخوں پر رینگ رہے تھے اس وقت سورج اپنی کمزور ہوتیں بے جان سرخ کرنوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں دھیرے دھیرے چھپتے جا رہا تھا۔ نازنین کا کمرہ لان کے بالکل ساتھ واقع تھا۔ اس نے اونچی آواز میں ٹی وی لگایا ہوا تھا اور اس وقت جگجیت سنگھ کی آواز میں پُر سوز گانا بج رہا تھا۔

"ہم تو یوں اپنی زندگی سے ملے

اجنبی جیسے اجنبی سے ملے"

برکت بی بی چلی گئی تھی اور خریم وہیں چٹائی پر غیر شعوری طور پر لیٹ گئی تھی۔ مگر اس کے لب پر جگجیت سنگھ کی غزل کے پہلے دو مصرعے جیسے اٹک گئے تھے۔ حالانکہ گیت تو کب سے ختم ہو گیا تھا۔

"ہم تو یوں اپنی زندگی سے ملے
اجنبی جیسے اجنبی سے ملے"

انگوروں کی بیل سے بہت سے بے جان زرد پتے گر گر کر خریم کے بالوں اور سارے کپڑوں پر جمع ہو گئے تھے۔ رات کی سیاہی گہری ہونے لگی تھی۔ شاید وہ بڑی دیر تک وہی پڑی رہتی مگر خالہ بی مغرب کی نماز پڑھ کر جب کچن میں گئیں اور خریم کو وہاں نہ دیکھ کر لان کی طرف آئیں۔تو خریم کو یوں بے سدھ اتنے اندھیرے میں پڑے دیکھ کر گر ٹھٹک گئیں وہ اب اس پر جھکی ہوئی تھیں مگر شاید وہ ارد گرد کے ماحول سے دور کہیں دور چلی گئی تھی خالہ بی نے اپنی نظر کا چشمہ ڈبیا سے نکالا اور اسے صاف کر کے آنکھوں پر لگاتے ہوئے خریم کی طرف دیکھا تو جیسے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی خریم انہیں لاش کی سی لگی۔ اب کہ انہوں نے اونچی اونچی ملازمتوں اور نازنین کو آواز دینا شروع کر دی۔ سب لوگ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ شرجیل کو بھی فون کر دیا گیا تھا۔اسے کمرے میں لے جا کر کمبل سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے منہ سے کچھ سمجھ میں ناں آنے والی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ شاید ابھی بھی گنگنا رہی تھی۔ جب شرجیل احمد گھر پہنچا تو خریم کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ چار گھنٹے تک خریم کو ہوش نہ آیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ خریم کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا تھا اور اس کے پٹھے کھینچے گئے ہیں۔ جو یقیناً کسی بہت بڑی ٹینشن کا نتیجہ تھا۔ خالہ بی حیران تھیں۔ کہ خریم کو آخر کیا ٹینشن تھی۔ انہوں نے شرجیل احمد سے بھی پوچھا مگر شرجیل کود ہی ایسی کسی بات سے انجان تھا۔ جو خریم کیلئے اتنی بڑی مصیبت کی وجہ ہوتی دو دن تک خریم ہسپتال میں ہی رہی اور پھر اسے چھٹی دے دی گئی خالہ بی کو جب کچھ سمجھ نہ آیا تو انہوں نے برکت بی بی کو اس سارے معاملے کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ شرجیل احمد سے بات کرتے ہوئے مہتاب بیگم نے خریم اور برکت بی بی کو گھنٹوں بیٹھے باتیں کرنے کا بتاتے ہوئے کہا کہ میں پہلے سے ہی جانتی تھی۔ یہ برکت بی بی کوئی اچھی عورت نہیں مجھے لگتا ہے کہ اس نے خریم پر جادو کر دیا ہے۔ شرجیل احمد تمہیں نہیں معلوم محلے کی ساری عورتیں تمہارے کاروبار میں جمے ہوئے پاؤں کو دیکھ کر حسد کرتی ہیں برکت بی بی نے تو اپنے شوہر پر بھی جادو کر دیا تھا۔ کچھ دن پہلے اس

کے محلے کی عورت آئی تھی ساتھ والے گھر پر میلاد میں بتا رہی تھی موصوفہ کا تعلق اس بازار سے ہے۔ جہاں رات کو دن مانا جاتا ہے۔ یہاں آکر تو بڑی نمازن پرہیزن بن گئی۔ اس لیے تو میں دھوکے میں آگئی کہ بیچاری کو کچھ پیسے مل جائیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بازاری عورتوں کے گن اب بھی ہیں۔ اس میں نظروں ہی نظروں میں ! دل کی گہرائی تک پہنچ جاتی ہے، ہاں طریقہ بدل گیا ہے۔ اب مردوں کی بجائے عورتوں کے دلوں کی ٹوہ لیتی ہیں۔ اور رات کو اپنے میاں کو سناتی رہتی ہے۔ مگر سنا ہے دونوں میاں بیوی ہیں بڑے راز دار .... اور یہ سب شاید سچ بھی تھا۔ ایک دن جب خریم اور برکت بی بی اکھٹے بیٹھیں خریم کے وجود میں لگے گہرے زخموں کو پھپھول رہی تھیں۔ تب ہی برکت بی بی زخموں میں سے رستے مادے کو نرمی سے صاف کرتے ہوئے کہیں کھو سی گئی تھی " خریم بیٹا عورت کیا کیا سہتی کیا کیا برداشت نہیں کرتی اپنا گھر بنانے کے لیے اپنے اپنوں کو خوش رکھنے کے لیے مگر تمہیں پتہ ہے یہ ہی دُکھ اور آہیں مرد اور عورت کو نزدیک لانے کا سب سے مضبوط سہارا ہوتے ہیں۔ مرد ہمیشہ روتی بلکتی مظلوم عورت کو ہی اپنے دل تک پہنچنے کی اجازت دیتا ہے۔ مرد کی محبت تب ہی پروانی چڑھتی ہے جب اُس کے اَنا کے بیج کو کوئی پانی ڈالتا رہے۔ تمہیں پتہ ہے۔ میرا شوہر جب کبھی

میرا محبوب ہوتا تھا اور وہ رات کو مجھے معطر بازاروں میں ملنے آتا تھا تو میرے حسن کے آگے اُس کی اَنا کا بیج کچھ دیر کے لیے دب جاتا تھا وہ میرے وجود کے ہر حصے پر سجدے کرتا تھا۔ مگر شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد جب مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا حسن اُس کی آنکھوں میں یکسانیت کے رنگ بھرنے لگا ہے۔ تب میں نے اسے اپنے ماضی کے سہے درد سے آشنا کر دیا وہ میرے رستے وجود سے اپنی اَنا کو تسکین پہنچاتا اور اس کی محبت پھر سے پھلنے پھولنے لگی مگر بیٹا ماضی کی پرچھائیاں کب تک اُس کے اندر موجود آنا کے بیج کی آبیاری کرتیں قصے تو ختم ہو ہی جاتے ہیں۔ میرے ماضی کے قصے بھی ایک دن ختم ہو گئے اور تب میں نے اپنی جیسی ہزاروں دوسری عورتوں کے ماضی ٹٹولنے شروع کر دیئے۔میرا خاوند اب غیر عورتوں کے قصے دلچسپی سے سننے لگا میں نے اس کے دل میں عورت کی بے بسی اور مظلومیت کی ایسی تصویر آویزاں کر دی کہ اب وہ مجھ سے چاہ کر بھی بے زار نہیں ہو سکتا مگر بیٹا ہم میاں بیوی ہیں بہت راز دار شرجیل خیریت سے ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ جب خالہ بی ذرا رکیں تو گویا ہوا مگر ماں جی اس کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے شوہر کو کیا ضرورت ہے۔ پرائی عورتوں کے قصے سننے کی خالہ بی اس دوران کسی اور خیالات میں گم تھیں۔ شرجیل احمد نے

سوال دوبارہ دہرایا تو وہ چونکیں " بیٹا دفع کرو ہمیں کیا ضرورت ہے وجہ معلوم کرنے کی میں تو سوچ میں ہوں کہ ہماری خریم کی کون سی ایسی باتیں ہیں جو وہ گھنٹوں بیٹھی برکت بی بی کو سناتی رہتی تھی۔ شرجیل احمد آہ بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

اگلے دن برکت بی بی آئی تو خالہ بی نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ برکت بی بی عجیب سے انداز میں مسکراتی رہی۔ اور زبان سے کچھ نہ بولی مگر جانے سے پہلے خالہ بی کو یہ کہہ کہ پریشان ہکا بکا چھوڑ گئی۔ مہتاب بیگم تمہاری بہو موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اسے بچالو اور پھر بہت زور زور سے ہنسنے لگی۔ اور جب رکی تو گویا ہوئی ہوئی مگر تم کیسے بچا سکتی ہو اس کو مگر اتنا ضرور کرنا کہ اسے کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھاؤ کہیں مرنے سے پہلے وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ ہا ہا ہاہا .... ہاہاہاہا۔

عزت کی ماں ندرت بیگم اپنی جوانی میں ایلزٹیار سے کم نہیں تھیں۔ فیصل آباد میں ان کے باپ داداؤں کی زمین تھیں پورا گاؤں ندرت کے والد پیر بخش کو چوہدری کہتا تھا۔ سال میں دودفعہ ایک کپاس کی کٹائی پھر اور ایک گندم کی کٹائی پر لوگ جھولیاں بھر بھر کے ان کے ہاں سے لے جاتے۔ گاؤں کی عورتیں جب کپاس چنتے چنتے پسینے سے شرابور ہو جاتیں تو اللہ رکھا پیر بخش کا خادم باقی خادموں کے ساتھ مل کر سب عورتوں کو تندوری روٹیوں کے ساتھ مکھن اور لسی بانٹنے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

لگتا۔ پیر بخش کی بیوی ندرت کی پیدائش پر اللہ کو پیاری ہو گئی تو ندرت اور اس کی بڑی بہن کی پرورش کیلئے پیر بخش کی چھوٹی بہن راحت بی بی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ گھر میں رزق کی فراوانی اور نوکروں کی ریل پیل کے باوجود راحت بیگم نے ندرت اور بڑی آپا کو ہر کام کرنے کا ہنر سکھایا گاؤں میں پڑھائی لکھائی کا زیادہ رواج نہ تھا۔ پھر بھی ندرت نے آٹھویں تک کی کتابیں گھر میں ہی پڑھ لی تھیں۔ البتہ بڑی آپا نے پڑھائی کی طرف کوئی توجہ نہ دی وہ سلائی کڑھائی اور ہاتھ کی سویاں اور نالے بُننیمیں بہت دلچسپی لیتی۔ دوپہر کو ان کے گھر جب بہت ساری عورتیں بیرونی احاطے میں موجود پانچ چھ تندوروں پر روٹیاں لگانے آتیں تو نوجوان لڑکیاں ان کے ارد گرد چار پائیاں بچھا کر گندے ہوئے میدے کی رنگ برنگی سویاں بنائیں۔ ایسے میں راحت بی بی بڑی سی کرسی کیکر کے درخت کے نیچے رکھے ندرت سے اپنی جوئیں صاف کروا لیتیں۔ دونوں بہنوں کو صبح پانچ بجے اٹھایا جاتا۔ فجر کی نماز سے پہلے وہ لسی اور مکھن بناتیں اور نماز کے بعد انہیں مسجد کے مولوی صاحب قرآن پاک پڑھاتے پھر وہ سب گھر والوں کیلئے ناشتہ بناتیں۔ گھر کی صفائی اور برتن صاف کرنے کیلئے ملازم تھے۔ مگر صبح، دوپہر اور شام کا کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا اور استری کرنا اور ان کاموں کے علاوہ سلائی کڑھائی

وغیرہ کرنا یہ سب دونوں بہنوں کے ذمہ تھا۔ پیر بخش زیادہ تر گھر سے باہر زمینوں پر ہی ہوتے تھے۔ جہاں ایک محفل سی جمی رہتی تھی۔ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی مشکلیں لے کر اُنہیں کے پاس آتے تھے۔ ایسے میں ان کی توجہ اپنی اولاد پر شاذو نادر ہی جاتی تھی۔ اور راحت بیگم کا کہنا تھا۔

”لڑکی ذات کو کھلاؤ جوائی وانگ تے دیکھو قصائی وانگ“

لڑکی ذات کو داماد کی طرح سے کھلاؤ پلاؤ مگر دیکھو قصائی کی طرح اس کے باوجود ندرت اور بڑی آپا کو کبھی ایسا نہ لگا کہ راحت بی بی ان کی ماں نہیں ہے۔ وہ ان کی خاطر ہر ایک سے لڑ پڑتی تھیں۔ راحت بی بی پیر بخش کو اکثر کہتیں کہ تو نے تو میری بیٹیوں کو فضول سمجھ کر اپنی زندگی میں شامل ہی نہیں کیا اگر ان کی جگہ بیٹے ہوتے تو میں دیکھتی کہ کس طرح تو گھر سے باہر رہتا اور پیر بخش ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ” آہا راحت باجی بیٹے ہوتے تب ناں “ پیر بخش کی ساری رحمدلی اور شفقت گھر سے باہر والوں کے لیے تھی۔ ندرت اور بڑی آپا باپ کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے ہمیشہ نا واقف رہیں بڑی آپا جب پندرہ سال کی تھیں تو راحت بی بی کو ٹی بی ہو گیا۔ روز بخار چڑھتا۔ پیر بخش بہن کو شہر بھی لے کر آیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ راحت بی بی اب جب کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھتی تو ندرت کے

علاوہ گاؤں کی ساری عورتیں اس سے دور رہنے کی کوشش کرتیں وہ اکثر سر گوشیاں کرتیں۔ کہ سنا ہے کہ ٹی بی تو جان نکال کر ہی رہتا ہے۔ اور یہ تو مریض کو چھونے سے ہی ہو جاتا ہے گاؤں کی عورتوں کی یہ بے رُخی راحت بی بی کو کرسی سے اٹھا کر چارپائی پر لے آئی۔ وہ سارا سارا دن احاطے میں کیکر کے نیچے چارپائی پر پڑی رہتیں ندرت کو راحت بی بی کی آنکھوں میں بجھتی ہوئی زندگی اس وقت نظر آئی جب دن ٹھنڈے اور چھوٹے ہونے لگے۔ راحت بی بی کھانستی جاتیں اور چارپائی کے نیچے رکھی راکھ میں تھوکتی جاتیں۔ اب ان کی تھوک میں بلغم کے ساتھ ساتھ خون بھی آنے لگا تھا۔ ندرت ہر تین گھنٹے بعد راکھ تبدیل کر دیتی اور راحت بی بی کی چارپائی دھوپ کی طرف کھسکا دیتی۔شام ہونے تک چارپائی کھسکتی کھسکتی احاطے کے کنارے پر لگے کیکر سے کھسک کر احاطے کے دوسرے کنارے پر واقع مہندی کے پودوں کے پاس پہنچ جاتی اور پھر ایک دن وہ چپکے سے اس جہاں سے چلی گئیں۔ پیر بخش نے راحت بی بی کے چالیسویں پر ہی بڑی آپا کا نکاح اپنے بھتیجے نصیر احمد سے کر دیا۔ ندرت بہت خوش تھی مگر اس وقت اس کے ہوش ہی اُڑ گئے جب اسے پتہ چلا کہ پیر بخش نے اس کی قسمت کا فیصلہ بھی سوچ رکھا ہے وہ زمین خاندان سے باہر نہیں بانٹنا چاہتے تھے اور خاندان میں نصیر احمد سے

چھوٹے بھائی عبداللہ کے علاوہ کوئی بھی لڑکا جو اننہ تھا مگر عبداللہ کا ذہن بچپن میں کسی بیماری کی وجہ سے ٹھیک نہیں رہا تھا۔ اُسے اکثر مرگی کا دورہ پڑتا۔ مگر پیر بخش کو اس رشتے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ندرت اس روز پھوٹ پھوٹ کر اپنی حقیقی ماں کو یاد کر کے بہت روئی کہ اگر وہ زندہ ہوتیں تو اب تک پیر بخش میں عورت کے دل کے ارمان اور حساسیت کی پہنچان ضرور پیدا ہو چکی ہوتی۔ ندرت اور بڑی آپا بیاہ کر کے لاہور آ گئیں۔ عبداللہ ایک ضدی بچے کی طرح تھا۔ ندرت پورا دن اس کے ساتھ اپنے بچپنے کی یادیں تازہ کرتی اور رات کو بیٹھ کر رو لیتی۔ عبداللہ اور نصیر احمد کے ساتھ انتظار حسین ان کی پھپھو کا بیٹا ماں باپ کے انتقال کے بعد ان

انتظار حسین اس بار دھاریں مار مار کر روئے تھے۔ اور انہیں لمحوں میں عزت نے تہیہ کیا تھا کہ میں اس بوڑھے وجود کی ساری خلائیں پر کروں گی۔ ہاں میں ضرور کروں گی عزت حسین۔

دوسری بار خالہ بی رمضان میں آئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بڑا بیٹا بھی تھا۔ عزت کو حیرت ہوئی کہ کیا ایسا شخص جس کے سارے چہرے پر جگہ جگہ دین کی مہریں لگی ہوئی تھیں طوائف سے شادی کر سکتا ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی اور اس کے ماتھے پر نمازوں سے محراب پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں بڑی آپا نے ندرت بیگم سے عزت کا رشتہ مانگا تھا۔ اپنے بڑے بیٹے کے لئے ندرت بیگم کو خالہ بی نے بتا دیا تھا کہ اُس واقع کے بعد ان کے بیٹے میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ وہ سنت کا پیروکار ہے اور دین کی چھاپ اس کے وجود پر سبت ہو گئی ہے۔ ندرت بیگم کو تو جیسے خزانہ مل گیا تھا ایسے انمول ہیرے کا تو انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ عزت حیران تھی کہ وہ ماں جو ساری زندگی اسے دین کا درس دیتی رہی اچھائی اور برائی میں تمیز سکھاتی رہی جس نے اچھائی کے رنگ اس میں اتنے گہرے کر دیے کہ برائی لاکھ کوشش کے باوجود اس کی شخصیت میں سما نہ سکی آج اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے شخص سے کرنا چاہتی ہیں جو پہلے سے شادی شدہ تھا اور جس کی وجہ سے اس کا باپ اس دنیا سے چلا گیا۔ جس نے خالہ بی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا مگر ندرت بیگم کا کہنا تھا کہ جو شخص خود برائی سے نکل کر اچھائی کی طرف آتا ہے جو گناہ سے واقفیت رکھتا ہے اور ایسی واقفیت رکھتا ہے

جس میں اس کا انگ انگ ڈوبا ہوا تھا اور پھر وہ واپس اچھائی کی طرف آتا ہے تو ایسے شخص کا ایمان بہت پختہ ہوتا ہے کسی شک و شبہات سے بالا تر ہوتا ہے۔ انتظار حسین نہ جانے اس معاملے میں کیوں نہیں بول رہے تھے۔ ان کی اولاد کااسقدر اہم فیصلہ ہونے جا رہا تھا اور وہ خاموش تھے رات کے کھانے کے بعد جب ندرت بیگم اور بڑی آپا اپنے کمرے میں چلے گئے اور انتظار حسین اسٹڈی روم میں تو عزت چپکے سے باپ کے پاس آئی تھی۔ انتظار حسین انگریزی کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے جب وہ ان کی پشت کی طرف سے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی انہوں نے فوراً اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے ناول ساتھ پڑی میز پر رکھ دیا " بابا وہ یہ میں یہ کہنے آئی تھی کہ .... عزت کچھ کہتے ہوئے جھجک رہی تھی بابا وہ دراصل میں چاہ رہی تھی کہ .... وہ دراصل میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی آپ پلیز خالہ بی کو منع کر دیں میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں " ۔ انتظار حسین خاموشی سے عزت کی بات سنتے رہے اور پھر بہت پیار سے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر اس کو اپنی کرسی کے سامنے پڑے میز پر بٹھا دیا " مگر بیٹا تمہیں پڑھنے سے کون روک رہا ہے تم جتنا چاہتی ہو اتنا پڑھو " " مگر بابا وہ خالہ رشتے کی بات کر رہی ہیں ...... وہ ....“ بیٹا مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں اس رشتے سے مسئلہ سے یا پھر

اس کے نامناسب وقت پر ہونے سے؟ "" دونوں سے " اب انتظار حسین تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر لمبی سانس بھرتے ہوئے بولے " ہوں .... تو ٹھیک ہے میں صبح ہی بڑی آپا کو منع کر دیتا ہوں۔ اب وہ اس کے ہاتھ تھپتھپا رہے تھے۔ عزت کو نہ جانے کیوں لگا کہ اس کے بابا بھی اس رشتے سے خوش ہیں۔ اس لیے جب وہ دوبارہ ناول اٹھا کر پڑھنے لگے تو عزت اٹھی نہیں اور پھر ذرا تو وقف سے بولتی "وہ بابا میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ ہو جائے؟ " تو انتظار حسین مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے " بیٹا میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرے حالانکہ تم ابھی عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹی ہو مگر میں تم میں ایک میچور لڑکی کو دیکھتا ہوں ہاں ایک بات ضرور یاد رکھنا کہ کوئی بھی فیصلہ ہو اپنی زندگی میں خود پر ظلم مت کرنا " عزت اب کہ دھیرے سے اُٹھ کر اسٹڈی روم سے باہر آ گئی تھی۔

عزت نے صبح ماں کے پوچھنے پر ہاں میں جواب دیا تھا سارے آنگن میں جیسے خوشیاں پھوٹ پڑی تھیں۔ حبیب اللہ اور خالہ بی خوشی سے ٹی وی پر لگے گانے پر ناچ رہے تھے۔ عزت نے دیکھا کہ انتظار حسین کی آنکھوں میں بھی ایک خوبصورت چمک تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ اپنے باپ کی آنکھوں کی ساری چمک کو

ہمیشہ کیلئے محفوظ کرلے ندرت بیگم کہہ رہی تھیں " دیکھ لو بڑی آپا اپنے تو اپنے ہوتے ہیں۔ بھلا ہی ساری زندگی ہم نے خاموشی سے تنہا گزار دی مگر آج جیسا سکون اور اطمینان میرے آنگن میں کبھی نہیں اُترا " اور عزت یہی تحریر باپ کی آنکھوں میں پڑھ رہی تھی " اپنے تو اپنے ہوتے ہیں"

عزت نے ایف ایس سی میں بہت اچھے نمبر لیے تھے ان دنوں چھٹیاں تھیں۔ اور اس کی دوستیں لاہور اور اسلام آباد کی مختلف میڈیکل یونیورسٹیوں میں اپلائی کر رہی تھیں عزت کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اس کا داخلہ کسی بھی یونیورسٹی میں ہو سکتا تھا۔ حبیب اللہ عزت کیلئے مختلف یونیورسٹیوں کے ایڈمیشن فارم لیا تھا جو عزت نے بہت خوشی خوشی بھر دیئے تھے مگر ایک دن خالہ بی کا فون آیا تو عزت کی ساری خوشیاں چکنا چور ہو گئیں۔ بڑی آپا نے کہا کہ ان کا بیٹا نہیں چاہتا کہ عزت گھر سے دور کہیں اور رہ کر پڑھے۔ ندرت بیگم یکدم پریشان ہو گئیں تو بڑی آپا نے کہا ندرت تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہم ایسا کرتے ہیں کہ ان دونوں کی شادی کر دیتے ہیں شادی کے بعد عزت لاہور آ جائے گی۔ تو جہاں چاہے داخلہ لے مگر عزت نے اس مشورے سے بالکل انکار کر دیاتو ندرت بیگم نے بڑی آپا سے ایک دفعہ پھر بات کر کے انہیں بیٹے کو سمجھانے کے لیے کہا جس

پر بڑی آپا نے حامی بھری۔ عزت نے فارم بھیج دیئے تھے اور اب انٹری ٹیسٹ تھا۔ اس دن جب وہ لاہور جانے کیلئے اپنے کپڑے بیگ میں رکھنے کے بعد کمرے سے باہر آئی تو ندرت بیگم کو صحن میں نہ پاکر وہ اسٹڈی روم کی طرف گئی۔ انتظار حسین بھی نہیں تھے تب اسے خیال آیا کہ وہ ساتھ والے گھر مرگ کے افسوس پر گئے ہیں۔ جس کا ذکر ندرت بیگم نے صبح ناشتے پر کیا تھا وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی وہ پاؤں گھسیٹتے گھسیٹتے سستی سے فون کی طرف بڑھی۔ اسے اب نیند آ رہی تھی اس نے بیزاری سے فون کا چونگہ اٹھایا تو آگے سے کسی بھاری آواز سے اسلام ُ علیکم سن کر عزت خواہ مخواہ نروس ہو گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی جب کہ دوسری طرف سے اُس کے حال پوچھے جا رہے تھے۔ عزت نے آہستہ سے " ٹھیک ہوں " کہا تھا اب دوسری طرف سے کوئی بہت نرم انداز میں اسے اس کے نام سے پکاررہا تھا " عزت آپ میری عزت ہیں آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری ماں کا بھیجا ہوا رشتہ قبول کیا " عزت کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بولے اور دوسری طرف بھی کچھ دیر کی خاموشی تھی عزت نے اپنی زندگی میں باپ اور حبیب اللہ کے سوا کسی مرد سے اپنے نام کو اسقدر پیار اور اپنائیت سے لیتے نہیں سنا تھا اور نہ ہی کتابوں اور ناولوں کے

علاوہ اس نے کسی مرد کو اپنی ہونے والی شریک سفر سے بات کرتے سنا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ ان موقعوں پر کیا بولا جائے دوسری طرف سے پھر کوئی بول رہا تھا "عزت ہو سکتا ہے میری شخصیت کے بارے میں آپ کے دل میں کچھ شکوک و شبہات ہوں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ماضی کا میرے حال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔میرے باپ کی موت نے اس دنیا کی حقیقت مجھ پر واضح کر دی ہے میں آپ کو سچے دل سے اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا ہوں " عزت کو ایک دم سے بہت شرم آئی تھی اور اب وہ کہہ رہا تھا " عزت میں چاہتا ہوں میری بیوی دنیا کی ناپاک نگاہوں سے دور رہے میں چاہتا ہوں کہ آپ مکمل پردہ کریں اور اگر آپ اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کی اس خواہش کا احترام کرتا ہوں مگر اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ پر کچھ حق رکھتا ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے گھر میں رہ کر اپنا یہ شوق پورا کریں " عزت کو نہ جانے کیوں لگا کہ یہ بہت چھوٹی سی بات ہے جس پر وہ شخص اتنے ڈھیر سارے عجز سے درخواست کر رہا تھا اُسے لگا کہ وہ کبھی بھی اسے انکار نہیں کر پائے گی اور واقع ہی اس نے لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا ساہیوال میں کوئی میڈیکل کالج نہ ہونے کی وجہ سے اس نے گورنمنٹ کالج میں انگلش لٹریچر کے مضامین رکھے وہ جو پہلے

پردہ کرنے کیلئے چادر لیتی تھی اب عبائیہ پہننے لگی تھی۔گھر میں اکثر کھانا پکانے میں دلچسپی لیتی تھی۔ ندرت بیگم حیران تھیں کہ عزت میں اتنی تبدیلی کیسے آ گئی تھی۔وہ اکثر اب ٹی وی پر اسلامی چینلز دیکھنے لگی تھی وہ جو فجر کی نماز کیلئے ندرت بیگم کے ہزار بار کہنے سے آنکھیں کھولتی اور جس کی وجہ سے بیشتر بار اُس کی نماز قضاء ہو جاتی اب تہجد کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی تھی وہ اب کتابوں کی موٹی موٹی باتوں سے نکل کر حقیقی زندگی کے رنگ جی رہی تھی شرجیل احمد نے کس قدر مختلف رنگ اس کے ارد گرد بھر دیئے تھے وہ سر سے پاؤں تک اس کی پسند میں ڈھلنے لگی تھی۔

شرجیل احمد کا فون اب روز آتا تھا اور عزت کالج سے آ کر اس کے فون کا انتظار کرتی تھی اور گھنٹے بھر اس کی باتیں سنتی رہتی وہ خود بہت کم بات کرتی تھی۔ شرجیل جب بات کرتے کرتے تھک جاتا تو اسے کچھ بولنے کو کہتا عزت بہت بھولے انداز میں کہتی مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں کیا بات کروں اور کیا بات کرنی چاہیے شرجیل احمد اس پر مسکرا دیتا اور کہتا کہ آپ پھر ان موٹی موٹی کتابوں میں

کیا پڑھتی ہیں سنا ہے لٹریچر میں تو بہت حسین داستانیں ہوتیں ہیں۔ جس پر عزت اس کو اپنے کسی پڑھے ہوئے ناول کی کہانی سنانے لگتی ہے۔ ایک دن عزت اسے DOLL HOUSEسنا رہی تھی کہانی کے اہتمام پر وہ بولی ویسے ایسے گھر کو گھر نہیں کہنا چاہیے جو ریاکاری اور فریب پر بنا ہو جو جھوٹ پر مبنی ہو دکھاوے کی زندگی کھوکھلی ہوتی ہے اُس سے کبھی خوشی نہیں ملتی DOLL HOUSE میں NORAنے بہت اچھا کیا جو ایسے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی مگر شرجیل احمد نے اس کی بات کاٹ دی ”مگر میں آپ کی بات سے اختلاف کرتا ہوں انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کھوکھلی ہی کیوں نہ لگے اُسے اپنے ساتھ جڑی زندگیوں کو دیکھنا چاہیے۔ اس کہانی میں NORA نے اپنی ماں ہونے کی ذمہ داری سے منہ موڑا ہے۔ اس طرح سے معاشرے تباہ ہو جائیں۔ عورت شادی کے بعد بیوی اور ماں ہوتی ہے اگر وہ کسی کی بیوی ہونے سے خوش نہیں ہے تو وہ کسی کی ماں ہونے کی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ عزت نے اس کی بات کو بہت نرمی سے قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ ”مگر اس صورت میں میاں بیوی کو چاہیے کہ وہ میاں بیوی ہی رہیں ماں باپ نہ بنیں جب تک وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہ لیں نئے رشتے قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے شرجیل احمد کچھ بولنا چاہتا تھا کہ عزت نے بات

کاٹتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ مگر ہمارے معاشرے میں دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی پڑھی لکھی عورت ایسا مشورہ اپنے شوہر کو دیتی ہے تو وہ کبھی بھی اپنے مجازی خدا کے منصب سے نیچے نہیں اترتاتو اس صورت میں پیدا ہونے والی اولاد پر اپنے باپ کی طرف سے ذمہ داری بنتی ہے اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ مستقبل میں ہوتا ہے تو عورت کا حق ہے کہ وہ یہ ذمہ داری اس کے باپ پر چھوڑ کر اس سے الگ ہو جائے شرجیل احمد کچھ دیر چُپ رہا اور پھر روکھے انداز میں بولا کہ عزت آپ اتنی پڑھی لکھی ہو کر جاہلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ اولاد کی بندش کرنا غیر اسلامی فعل ہے اور جب اولاد ہو جائے تو ماں ہی اس کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے وہ کسی صورت اپنی ذمہ داری چھوڑنے کا حق نہیں رکھتی۔ عزت بھی کچھ بگڑے لہجے میں بولی تھی اور وہ مرد جو ساری ذمہ داریاں عورت کے کندھوں پر ڈال کر دوسری شادی کر لیتے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ شرجیل احمد ہنستے ہوئے بولا تو کیا؟ مرد کو چار شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہاہاہاہا اب وہ کہیں جلد پہنچنے کا کہہ کہ فون بند کر رہا تھا۔

عزت کالج میں اپنا منفرد مزاج اور طبیعت رکھنے کی وجہ سے جانی جاتی تھی۔ انگلش Debatesہوں یا کوئی شاعری کا مقابلہ وہ ہر ایک میں پوزیشن لیتی تھی۔ عزت

خوش تھی کہ ندرت بیگم کی وجہ سے جو خواب اس نے ادھورے چھوڑ کر میڈیکل میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا شرجیل احمد نے ان خوابوں کو دوبارہ اسے لٹا دیا تھا۔ عزت کے پاس اب اپنی دوستوں میں اپنے کزن اور منگیتر کے بارے میں کہنے کیلئے بہت کچھ تھا وہ بہت چہک چہک کر اپنے اور شرجیل احمد کے درمیان ہونے والی باتوں کو شیئر کرتی۔ دو سال عزت کے جیسے ہواؤں میں گزرے تھے۔ شرجیل کا اپنے ساتھ بحث کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو جان سکتے تھے اور پھر جب بھی بحث کے دوران لڑائی ہوتی تو عزت ہمیشہ منانے میں پہل کرتی تھی مگر جیسے ہی .... عزت بی۔اے میں ہوئی، محلے کی عورتیں اس کی شادی کا پوچھنے لگی تھیں۔ ندرت بیگم نے ہلکے پھلکے انداز میں بڑی آپا سے اس بارے میں بات بھی کی۔ مگر بڑی آپا نے بات کو ٹال دیا تھا۔ ندرت بیگم ذاتی طور پر ابھی عزت کی شادی کے حق میں نہ تھیں۔ مگر جس معاشرے میں وہ رہتی تھیں وہاں لڑکی کو منگنی کے بعد زیادہ دیر تک گھر میں بٹھانا مایوب سمجھا جاتا تھا۔ پچھلے دنوں ہی محلے کی ایک لڑکی کی منگنی ٹوٹی تو جیسے محلے میں عورتوں کی زنگ لگی زبانوں میں ایک دم نئی روح پھونکی گئی تھی۔ ہر ایک کے پاس ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو تھے۔ گھما پھرا کر بات لڑکی میں کسی نقص ہونے پر ختم ہو جاتی اور

تو اور لوگوں نے یہ ٹک کہا کہ لڑکی تو شروع دن سے شادی پر راضی نہ تھی۔ دل کے تار کہیں اور ملے ہوں تو ایسے زبردستی کے رشتوں میں تھوڑی نہ دلچسپی ہوتی ہے۔یہ لڑکی تو تھی ہی ایسی بھلا آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نگل سکتا ہے۔ اور اس لمحے کسی کو اپنے گھر اپنی بیٹیوں کا خیال نہ آتا۔ ندرت بیگم اسی وجہ سے جلد اپنے حصے کا بوجھ اُتارنا چاہتی تھیں مگر تقدیر کے فیصلے تو اٹل ہوتے ہیں۔

کالج میں اس وقت بی اے سال چہارم کے پیپرز نزدیک آ جانے کی وجہ سے زیادہ تر لڑکیاں کالج نہیں آ رہی تھیں عزت بھی اکثر گھر پر ہی ہوتی۔ مگر آج عزت کے گروپ کی لڑکیوں نے مل کر عزت کو سرپرائز برتھ ڈے پارٹی دینے کیلئے کالج بلا لیا تھا۔ وہ ساری فوارے والے گراؤنڈ میں بیٹھیں بہت مزہ کر رہی تھیں۔ کیک کاٹنے کے بعد جب ان کے درمیان گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔تب شہلا عزت کی دوست اُس سے چہک چہک کر شرجیل احمد کی طرف سے دیئے گئے تحفے اور الفاظ کا پوچھنے لگی عزت کو تو یہاں آنے سے پہلے اپنی برتھ ڈے کا معلوم ہی ناں تھا اور ناں ہی آج تک شرجیل احمد نے اس کو برتھ ڈے وش کیا تھا۔ہاں رات کو انتظار حسین ضرور ایک کیک لے آتے تھے۔ جو اس کی چھوٹی سی فیملی مل کے کھاتی مگر ندرت بیگم کو کیک اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کیک پر لگی کریم کو الگ کر دیا

کرتی تھیں عزت کا ہمیشہ سے دل چاہتا تھا کہ شرجیل احمد اس کو اس کی برتھ ڈے پر وش کرلے یا پھر ویلنٹائن ڈے پر کبھی پھول بھیجے مگر شرجیل احمد اس کو مذہب کے منافی چیزیں گردانتا تھا اور اس پر دونوں میں بہت دفعہ بحث ہو چکی تھی۔ اور بات ہمیشہ لڑائی پر ختم ہوتی۔ اس وقت شہلا کے پوچھے گئے سوال پر وہ بہت اداس ہو گئی تھی۔ مگر اس نے بات کو سہولت سے ٹال دیا۔ اب شہلا اپنے منگیتر کی دی ہوئی گھڑی اور ایئر رنگزسب کو دکھا رہی تھی۔

بی۔ اے کے پیپرز ہو رہے تھے۔ عزت پیپر دے کر آتی تو دھرام سے بیڈ پر گر جاتی پھر گھنٹوں سونے کے بعد اس وقت کمرے سے باہر نکلتی جب رات گہری ہو جاتی ندرت بیگم اس کو کھانا دیتیں اور پھر وہ انتظار حسین کے اسٹڈی روم میں جا کر ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ جاتی اگلے پیپر کی تیاری وہ اگلی چھٹی میں ہی کرتی۔ ان دنوں شرجیل احمد روز فون نہیں کر رہا تھا۔ اور عزت بھی حیران تھی کہ وہ پہلے جب کبھی کسی روز فون نہیں کرتا تھا۔ تو وہ کتنی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ مگر آج کل شاید زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس کے فون نہ کرنے پر وہ مطمئن ہی رہتی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا کہ اگر شرجیل فون کرے گا تو ضرور کوئی بحث شروع ہو گی۔ جس پر خواہ مخواہ کی لڑائی کے ساتھ ساتھ پڑھائی کے لئے وقت ہی ضائع ہو

گا۔ ایک دن تو شرجیل احمد کے فون پر اس نے ندرت بیگم سے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ دیا کہ انہیں کہیں کہ عزت سو رہی ہے۔ آخری پیپر کے روز سب لڑکیوں نے اپنے بھائیوں رشتے والے انکلوں اور ویگن والے بھائیوں کو آدھا آدھا گھنٹہ دیر سے آنے کو کہا تھا۔

عزت کے گروپ کی ساری لڑکیاں افسردہ دلوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ کیوں کہ بی اے کے بعد بہت سی لڑکیوں کی شادی ہونے والی تھی۔ اور کسی کو آگے جاب کرنے کا خبط تھا۔ سب لڑکیاں جس کی شادی ہونی تھی۔ اپنی باقی دوستوں کو شادی پر آنے کا ایڈوانس میں پیغام دے رہی تھیں۔ کسی نے عزت سے بھی پوچھا تھا کہ " عزت تم بتاؤ تم کب پیا دیس جا رہی ہو " ؟ کسی دوسری نے کہا تھا کہ عزت کے سسرال والے بھول گئے منگنی کر کے اب شہلا پوچھ رہی تھی کہ عزت کیا تم شرجیل بھائی سے محبت کرتی ہو؟ عزت ان ڈھیر سارے سوالوں پر کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ مگر آخری سوال پر وہ چونک کر بولی تھی " تو اور کیا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے اور شرجیل بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں " اس نے اتنی سی بات کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ شرجیل احمد سے منگنی کے بعد عزت نے عام لڑکیوں کی طرح ہنسنا بولنا اور اٹھنا بیٹھنا، سیکھا تھا۔ شرجیل

کو شروع شروع میں اس کی باتوں سے کوفت ہوئی تھی۔ عزت نے شرجیل کی خاطر اپنی بچپن کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والی عادت ختم کر دی تھی۔ اور بہت ساری دوستیں بنائیں تھیں۔ جن سے اس نے ہلکی پھلکی باتیں کرنا اور زندگی کے طور طریقے سیکھے تھے۔ ورنہ زندگی کے بیس سال اس نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی۔ اس نے اسے وقت سے پہلے بہت بڑا کر دیا تھا۔ کتنا تبدیل ہو ئی تھی۔ وہ یہ شرجیل احمد کیلئے محبت نہ تھی۔ تو اور کیا تھا۔ اس دن جب شرجیل احمد کا فون آیا تو وہ اس سے محبت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ " شرجیل آپ محبت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا آپکی نظر میں محبت کیا ہے۔ شرجیل احمد ہنسنے لگا تھا اور پھر ہنستے ہنستے جیسے بے دھیانی میں ہی اس نے عزت کو کسی اور نام سے مخاطب کیا تھا۔ خریم محبت وہ ہے جو میں تم سے کرتا ہوں " عزت کو یکدم سے دھچکا لگا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا تھا۔ شرجیل آپ نے کیا کہا اور اب کی بار شرجیل احمد نے عزت کو اسی کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ عزت محبت جس کو بھی کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس میں انسان اپنی ذات کو دبا کر اپنے محبوب کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی ذات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی عام صورت حال میں جب کسی وجہ سے انسان کو اپنی ذات کو دبانا پڑے تو اسے یہ ایک قربانی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

لگتا ہے۔ مگر محبت میں یہی قربانی فریضے کا روپ دھاڑ لیتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ انسان ایسی محبت صرف اپنے خدا سے کر سکتا ہے۔ شرجیل احمد ذرا رُکا تھا جب عزت نے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا تھا شرجیل آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ اور شرجیل احمد اب پھر قہقہہ لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان محبت ہوتی ہی ہے۔ میں بھی تم سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنا کوئی شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے عزت کو شرجیل کے اب ایسی باتوں سے کوفت ہوئی تھی۔ اب وہ ایسی باتوں پر بحث کبھی نہیں کرتی تھی۔ شاید کچھ تھا جو ختم ہو رہا تھا۔ ایم۔ اے کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ اور واقعی ہی گورنمنٹ کالج میں عزت کی کلاس میں کوئی بھی ایسی لڑکی ناں تھی۔ جو بی اے میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ زیادہ کی شادی ہو گئی تھی شروع شروع میں کالج میں عزت کا زیادہ دل نہیں لگا۔ تو اس نے پھر سے اپنے باپ کی دی ہوئیں مختلف کتابیں پڑھنا شروع کر دیں شرجیل احمد کو شاید اچھا نہیں لگا تھا۔ کہ عزت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔اس لیے مہتاب بیگم نے ندرت بیگم کو ڈھکے چھپے انداز میں کہا تھا کہ عزت کو اب کوئی گھر کا کام کاج بھی سکھاؤ کوئی سلائی کڑھائی بھی آنا چاہیے۔ لڑکیوں کو ندرت بیگم سمجھیں مہتاب بیگم اب جلدی یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے سوچ رہی ہیں۔

اس لیے انہوں نے عزت کو اب گھر بیٹھنے کو کہا تھا۔ اور یہ بھی کہ گروہ آگے پڑھنا چاہے گی تو شادی کے بعد پڑھتی رہے۔ مگر عزت نے صاف کہہ دیا کہ جب شادی ہو گی۔ تو وہ نہیں جائے گی۔ وہ پہلے سے گھر میں بیٹھ کر شادی کا انتظار نہیں کر سکتی۔ شرجیل احمد نے اس بار خود فون کر کے عزت سے کہا تھا۔ " عزت میں چاہتا ہوں تم قرآن حفظ کرو یا ترجمہ، تفسیر، دیکھو عزت عورت جتنا ہی پڑھ لکھ لے اسے گھر سنبھالنا ہوتا ہے۔ بچے پالنے ہوتے ہیں۔ ماں اگر مذہب کے قریب ہو بچے بھی جلد مذہب کو سمجھنے لگتے ہیں۔ عزت کو یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ مگر کسی جھگڑے سے بچنے کے لیے اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا " شرجیل آپ کو کیسی بیوی چاہیے " اور شرجیل احمد نے کہا تھا " جو میرے بچوں کی اچھی تربیت کر سکتے " اب کہ عزت نے کہا تھا کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو بیوی نہیں چاہیے اپنے بچوں کے لیے ماں چاہیے۔ اور پھر شرجیل اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنے کے لیے ماں کا حافظ قرآن ہونا کیوں ضروری ہے اگر ماں پڑھی لکھی ہو تو وہ یقینا بچوں کی اچھی تربیت کر سکتی ہے۔ وہ بچوں کو قرآن میں دیئے گئے اللہ کے پیغام کو سمجھا سکتی ہے۔ اور میں کونسا اپنے مذہب سے دوریوں۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے عبائیہ پہنا۔ دینی کتابیں پڑھیں ٹی وی پر وہ چینلز میری اولین ترجیح

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

بن گئے جو آپ نے مجھے دینی معلومات کے لیے دیکھنے کو کہے تھے۔ اور اس کے جواب میں شرجیل احمد نے بہت سکون سے کہا تھا " یہی تو عزت میں چاہتا ہوں تم یہ ساری چیزیں خود کرو۔ اپنے شوق۔سے میرے لیے نہیں اللہ کے لیے "" تو شرجیل احمد آپ میرے ایمان پر آج شک کر رہے ہیں۔ اس بار شرجیل احمد نے کچھ جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

شرجیل احمد کا فون اب روز آتا تھا اور عزت کالج سے آ کر اس کے فون کا انتظار کرتی تھی اور گھنٹے بھر اس کی باتیں سنتی رہتی وہ خود بہت کم بات کرتی تھی۔ شرجیل جب بات کرتے کرتے تھک جاتا تو اسے کچھ بولنے کو کہتا عزت بہت بھولے انداز میں کہتی مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں کیا بات کروں اور کیا بات کرنی چاہیے شرجیل احمد اس پر مسکرا دیتا اور کہتا کہ آپ پھر ان موٹی موٹی کتابوں میں کیا پڑھتی ہیں سنا ہے لٹریچر میں تو بہت حسین داستانیں ہوتیں ہیں۔ جس پر عزت اس کو اپنے کسی پڑھے ہوئے ناول کی کہانی سنانے لگتی ہے۔ ایک دن عزت اسے DOLL HOUSEسنا رہی تھی کہانی کے اہتمام پر وہ بولی ویسے ایسے گھر کو گھر نہیں کہنا چاہیے جو ریاکاری اور فریب پر بنا ہو جو جھوٹ پر مبنی ہو دکھاوے کی زندگی کھوکھلی ہوتی ہے اُس سے کبھی خوشی نہیں ملتی DOLL HOUSE میں

NORAنے بہت اچھا کیا جو ایسے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی مگر شرجیل احمد نے اس کی بات کاٹ دی ” مگر میں آپ کی بات سے اختلاف کرتا ہوں انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کھوکھلی ہی کیوں نہ لگے اُسے اپنے ساتھ جڑی زندگیوں کو دیکھنا چاہیے۔ اس کہانی میں NORA نے اپنی ماں ہونے کی ذمہ داری سے منہ موڑا ہے۔ اس طرح سے معاشرے تباہ ہو جائیں۔ عورت شادی کے بعد بیوی اور ماں ہوتی ہے اگر وہ کسی کی بیوی ہونے سے خوش نہیں ہے تو وہ کسی کی ماں ہونے کی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ عزت نے اس کی بات کو بہت نرمی سے قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ ” مگر اس صورت میں میاں بیوی کو چاہیے کہ وہ میاں بیوی ہی رہیں ماں باپ نہ بنیں جب تک وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہ لیں نئے رشتے قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے شرجیل احمد کچھ بولنا چاہتا تھا کہ عزت نے بات کاٹتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ مگر ہمارے معاشرے میں دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی پڑھی لکھی عورت ایسا مشورہ اپنے شوہر کو دیتی ہے تو وہ کبھی بھی اپنے مجازی خدا کے منصب سے نیچے نہیں اترتاتو اس صورت میں پیدا ہونے والی اولاد پر اپنے باپ کی طرف سے ذمہ داری بنتی ہے اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ مستقبل میں ہوتا ہے تو عورت کا حق ہے کہ وہ یہ ذمہ داری اس کے باپ پر چھوڑ کر اس سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

الگ ہو جائے شرجیل احمد کچھ دیر چُپ رہا اور پھر روکھے انداز میں بولا کہ عزت آپ اتنی پڑھی لکھی ہو کر جاہلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ اولاد کی بندش کرنا غیر اسلامی فعل ہے اور جب اولاد ہو جائے تو ماں ہی اس کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے وہ کسی صورت اپنی ذمہ داری چھوڑنے کا حق نہیں رکھتی۔ عزت بھی کچھ بگڑے لہجے میں بولی تھی اور وہ مرد جو ساری ذمہ داریاں عورت کے کندھوں پر ڈال کر دوسری شادی کر لیتے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ شرجیل احمد ہنستے ہوئے بولا تو کیا؟ مرد کو چار شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہاہاہاہا اب وہ کہیں جلد پہنچنے کا کہہ کہ فون بند کر رہا تھا۔

عزت کالج میں اپنا منفرد مزاج اور طبیعت رکھنے کی وجہ سے جانی جاتی تھی۔ انگلش Debatesہوں یا کوئی شاعری کا مقابلہ وہ ہر ایک میں پوزیشن لیتی تھی۔ عزت خوش تھی کہ ندرت بیگم کی وجہ سے جو خواب اس نے ادھورے چھوڑ کر میڈیکل میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا شرجیل احمد نے ان خوابوں کو دوبارہ اسے لٹا دیا تھا۔ عزت کے پاس اب اپنی دوستوں میں اپنے کزن اور منگیتر کے بارے میں کہنے کیلئے بہت کچھ تھا وہ بہت چہک چہک کر اپنے اور شرجیل احمد کے درمیان ہونے والی باتوں کو شیئر کرتی۔ دو سال عزت کے جیسے ہواؤں میں گزرے تھے۔ شرجیل

کا اپنے ساتھ بحث کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو جان سکتے تھے اور پھر جب بھی بحث کے دوران لڑائی ہوتی تو عزت ہمیشہ منانے میں پہل کرتی تھی مگر جیسے ہی .... عزت بی۔اے میں ہوئی، محلے کی عورتیں اس کی شادی کا پوچھنے لگی تھیں۔ ندرت بیگم نے ہلکے پھلکے انداز میں بڑی آپا سے اس بارے میں بات بھی کی۔ مگر بڑی آپا نے بات کو ٹال دیا تھا۔ ندرت بیگم ذاتی طور پر ابھی عزت کی شادی کے حق میں نہ تھیں۔ مگر جس معاشرے میں وہ رہتی تھیں وہاں لڑکی کو منگنی کے بعد زیادہ دیر تک گھر میں بٹھانا مایوب سمجھا جاتا تھا۔ پچھلے دنوں ہی محلے کی ایک لڑکی کی منگنی ٹوٹی تو جیسے محلے میں عورتوں کی زنگ لگی زبانوں میں ایک دم نئی روح پھونکی گئی تھی۔ ہر ایک کے پاس ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو تھے۔ گھما پھرا کر بات لڑکی میں کسی نقص ہونے پر ختم ہو جاتی اور تو اور لوگوں نے یہ تک کہا کہ لڑکی تو شروع دن سے شادی پر راضی نہ تھی۔ دل کے تار کہیں اور ملے ہوں تو ایسے زبردستی کے رشتوں میں تھوڑی نہ دلچسپی ہوتی ہے۔یہ لڑکی تو تھی ہی ایسی بھلا آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نگل سکتا ہے۔ اور اس لمحے کسی کو اپنے گھر اپنی بیٹیوں کا خیال نہ آتا۔ ندرت بیگم اسی وجہ سے جلد اپنے حصے کا بوجھ اُتارنا چاہتی تھیں مگر تقدیر کے فیصلے تو اٹل ہوتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

کالج میں اس وقت بی اے سال چہارم کے پیپرز نزدیک آ جانے کی وجہ سے زیادہ تر لڑکیاں کالج نہیں آ رہی تھیں عزت بھی اکثر گھر پر ہی ہوتی۔ مگر آج عزت کے گروپ کی لڑکیوں نے مل کر عزت کو سرپرائز برتھ ڈے پارٹی دینے کیلئے کالج بلا لیا تھا۔ وہ ساری فوارے والے گراؤنڈ میں بیٹھیں بہت مزہ کر رہی تھیں۔ کیک کاٹنے کے بعد جب ان کے درمیان گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔تب شہلا عزت کی دوست اُس سے چہک چہک کر شرجیل احمد کی طرف سے دیئے گئے تحفے اور الفاظ کا پوچھنے لگی عزت کو تو یہاں آنے سے پہلے اپنی برتھ ڈے کا معلوم ہی ناں تھا اور ناں ہی آج تک شرجیل احمد نے اس کو برتھ ڈے وش کیا تھا۔ہاں رات کو انتظار حسین ضرور ایک کیک لے آتے تھے۔ جو اس کی چھوٹی سی فیملی مل کے کھاتی مگر ندرت بیگم کو کیک اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کیک پر لگی کریم کو الگ کر دیا کرتی تھیں عزت کا ہمیشہ سے دل چاہتا تھا کہ شرجیل احمد اس کو اس کی برتھ ڈے پر وش کر لے یا پھر ویلنٹائن ڈے پر کبھی پھول بھیجے مگر شرجیل احمد اس کو مذہب کے منافی چیزیں گردانتا تھا اور اس پر دونوں میں بہت دفعہ بحث ہو چکی تھی۔ اور بات ہمیشہ لڑائی پر ختم ہوتی۔ اس وقت شہلا کے پوچھے گئے سوال پر وہ بہت اداس

ہو گئی تھی۔ مگر اس نے بات کو سہولت سے ٹال دیا۔ اب شہلا اپنے منگیتر کی دی ہوئی گھڑی اور ایئر رنگزسب کو دکھا رہی تھی۔

بی۔ اے کے پیپرز ہو رہے تھے۔ عزت پیپر دے کر آتی تو دھرام سے بیڈ پر گر جاتی پھر گھنٹوں سونے کے بعد اس وقت کمرے سے باہر نکلتی جب رات گہری ہو جاتی ندرت بیگم اس کو کھانا دیتیں اور پھر وہ انتظار حسین کے اسٹڈی روم میں جا کر ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ جاتی اگلے پیپر کی تیاری وہ اگلی چھٹی میں ہی کرتی۔ ان دنوں شرجیل احمد روز فون نہیں کر رہا تھا۔ اور عزت بھی حیران تھی کہ وہ پہلے جب کبھی کسی روز فون نہیں کرتا تھا۔ تو وہ کتنی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ مگر آج کل شاید زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس کے فون نہ کرنے پر وہ مطمئن ہی رہتی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا کہ اگر شرجیل فون کرے گا تو ضرور کوئی بحث شروع ہو گی۔ جس پر خواہ مخواہ کی لڑائی کے ساتھ ساتھ پڑھائی کے لئے وقت ہی ضائع ہو گا۔ ایک دن تو شرجیل احمد کے فون پر اس نے ندرت بیگم سے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ دیا کہ انہیں کہیں کہ عزت سو رہی ہے۔ آخری پیپر کے روز سب لڑکیوں نے اپنے بھائیوں رشتے والے انکلوں اور ویگن والے بھائیوں کو آدھا آدھا گھنٹہ دیر سے آنے کو کہا تھا۔

عزت کے گروپ کی ساری لڑکیاں افسردہ دلوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ کیوں کہ بی اے کے بعد بہت سی لڑکیوں کی شادی ہونے والی تھی۔ اور کسی کو آگے جاب کرنے کا خبط تھا۔ سب لڑکیاں جس کی شادی ہونی تھی۔ اپنی باقی دوستوں کو شادی پر آنے کا ایڈوانس میں پیغام دے رہی تھیں۔ کسی نے عزت سے بھی پوچھا تھا کہ " عزت تم بتاؤ تم کب پیا دیس جا رہی ہو " ؟ کسی دوسری نے کہا تھا کہ عزت کے سسرال والے بھول گئے منگنی کر کے اب شہلا پوچھ رہی تھی کہ عزت کیا تم شرجیل بھائی سے محبت کرتی ہو؟ عزت ان ڈھیر سارے سوالوں پر کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ مگر آخری سوال پر وہ چونک کر بولی تھی " تو اور کیا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے اور شرجیل بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں " اس نے اتنی سی بات کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ شرجیل احمد سے منگنی کے بعد عزت نے عام لڑکیوں کی طرح ہنسنا بولنا اور اٹھنا بیٹھنا، سیکھا تھا۔ شرجیل کو شروع شروع میں اس کی باتوں سے کوفت ہوئی تھی۔ عزت نے شرجیل کی خاطر اپنی بچپن کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والی عادت ختم کر دی تھی۔ اور بہت ساری دوستیں بنائیں تھیں۔ جن سے اس نے ہلکی پھلکی باتیں کرنا اور زندگی کے طور طریقے سیکھے تھے۔ ورنہ زندگی کے بیس سال اس نے جس ماحول میں تربیت

پائی تھی۔ اس نے اسے وقت سے پہلے بہت بڑا کر دیا تھا۔ کتنا تبدیل ہو ئی تھی۔ وہ یہ شرجیل احمد کیلئے محبت نہ تھی۔ تو اور کیا تھا۔ اس دن جب شرجیل احمد کا فون آیا تو وہ اس سے محبت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ " شرجیل آپ محبت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا آپکی نظر میں محبت کیا ہے۔ شرجیل احمد ہنسنے لگا تھا اور پھر ہنستے ہنستے جیسے بے دھیانی میں ہی اس نے عزت کو کسی اور نام سے مخاطب کیا تھا۔ خریم محبت وہ ہے جو میں تم سے کرتا ہوں " عزت کو یکدم سے دھچکا لگا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا تھا۔ شرجیل آپ نے کیا کہا اور اب کی بار شرجیل احمد نے عزت کو اسی کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ عزت محبت جس کو بھی کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس میں انسان اپنی ذات کو دبا کر اپنے محبوب کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی ذات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی عام صورت حال میں جب کسی وجہ سے انسان کو اپنی ذات کو دبانا پڑے تو اسے یہ ایک قربانی لگتا ہے۔ مگر محبت میں یہی قربانی فریضے کا روپ دھاڑ لیتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ انسان ایسی محبت صرف اپنے خدا سے کر سکتا ہے۔شرجیل احمد ذرا رُکا تھا جب عزت نے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا تھا شرجیل آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ اور شرجیل احمد اب پھر قہقہہ لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان

محبت ہوتی ہی ہے۔ میں بھی تم سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنا کوئی شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے عزت کو شرجیل کے اب ایسی باتوں سے کوفت ہوئی تھی۔ اب وہ ایسی باتوں پر بحث کبھی نہیں کرتی تھی۔ شاید کچھ تھا جو ختم ہو رہا تھا۔ ایم۔ اے کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ اور واقعی ہی گورنمنٹ کالج میں عزت کی کلاس میں کوئی بھی ایسی لڑکی ناں تھی۔ جو بی اے میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ زیادہ کی شادی ہو گئی تھی شروع شروع میں کالج میں عزت کا زیادہ دل نہیں لگا۔ تو اس نے پھر سے اپنے باپ کی دی ہوئیں مختلف کتابیں پڑھنا شروع کر دیں شرجیل احمد کو شاید اچھا نہیں لگا تھا۔ کہ عزت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔اس لیے مہتاب بیگم نے ندرت بیگم کو ڈھکے چھپے انداز میں کہا تھا کہ عزت کو اب کوئی گھر کا کام کاج بھی سکھاؤ کوئی سلائی کڑھائی بھی آنا چاہیے۔ لڑکیوں کو ندرت بیگم سمجھیں مہتاب بیگم اب جلدی یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے سوچ رہی ہیں۔

اس لیے انہوں نے عزت کو اب گھر بیٹھنے کو کہا تھا۔ اور یہ بھی کہ گروہ آگے پڑھنا چاہے گی تو شادی کے بعد پڑھتی رہے۔ مگر عزت نے صاف کہہ دیا کہ جب شادی ہو گی۔ تو وہ نہیں جائے گی۔ وہ پہلے سے گھر میں بیٹھ کر شادی کا انتظار نہیں کر سکتی۔ شرجیل احمد نے اس بار خود فون کر کے عزت سے کہا تھا۔ " عزت میں

چاہتا ہوں تم قرآن حفظ کرو یا ترجمہ، تفسیر، دیکھو عزت عورت جتنا ہی پڑھ لکھ لے اسے گھر سنبھالنا ہوتا ہے۔ بچے پالنے ہوتے ہیں۔ ماں اگر مذہب کے قریب ہو بچے بھی جلد مذہب کو سمجھنے لگتے ہیں۔ عزت کو یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ مگر کسی جھگڑے سے بچنے کے لیے اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا " شرجیل آپ کو کیسی بیوی چاہیے " اور شرجیل احمد نے کہا تھا " جو میرے بچوں کی اچھی تربیت کر سکتے " اب کہ عزت نے کہا تھا کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو بیوی نہیں چاہیے اپنے بچوں کے لیے ماں چاہیے۔ اور پھر شرجیل اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنے کے لیے ماں کا حافظ قرآن ہونا کیوں ضروری ہے اگر ماں پڑھی لکھی ہو تو وہ یقینا بچوں کی اچھی تربیت کر سکتی ہے۔ وہ بچوں کو قرآن میں دیئے گئے اللہ کے پیغام کو سمجھا سکتی ہے۔ اور میں کونسا اپنے مذہب سے دوریوں۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے عبائیہ پہنا۔ دینی کتابیں پڑھیں ٹی وی پر وہ چینلز میری اولین ترجیح بن گئے جو آپ نے مجھے دینی معلومات کے لیے دیکھنے کو کہے تھے۔ اور اس کے جواب میں شرجیل احمد نے بہت سکون سے کہا تھا " یہی تو عزت میں چاہتا ہوں تم یہ ساری چیزیں خود کرو۔ اپنے شوق۔سے میرے لیے نہیں اللہ کے لیے "" تو

شرجیل احمد آپ میرے ایمان پر آج شک کر رہے ہیں۔ اس بار شرجیل احمد نے کچھ جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

آپ کے کہنے کے مطابق میں نے عبائیہ پہنا۔ دینی کتابیں پڑھیں ٹی وی پر وہ چینلز میری اولین ترجیح بن گئے جو آپ نے مجھے دینی معلومات کے لیے دیکھنے کو کہے تھے۔ اور اس کے جواب میں شرجیل احمد نے بہت سکون سے کہا تھا " یہی تو عزت میں چاہتا ہوں تم یہ ساری چیزیں خود کرو۔ اپنے شوق۔سے میرے لیے نہیں اللہ کے لیے "" تو شرجیل احمد آپ میرے ایمان پر آج شک کر رہے ہیں۔ اس بار شرجیل احمد نے کچھ جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

بہت دن تک شرجیل احمد نے فون نہیں کیا تھا۔ عزت اپنی پڑھائی میں مصروف ہو کر بالکل بھول گئی کہ شرجیل احمد سے کوئی جھگڑا بھی ہوا تھا اس کا۔ ان کے رشتے کو چار سال مکمل ہونے والے تھے۔ اور جیسے اس رشتے کے سارے رنگ آہستہ آہستہ پھیکے پڑنے لگے تھے۔ وہ بحث جو شروع شروع میں عزت کو اچھی لگی تھی۔ اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ شرجیل احمد کے ساتھ اس کی کسی بھی بحث

سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوتا۔ بالکل بے معانی ہوتی تھی۔ اُن کی بحث جس کے آخر پر ہمیشہ جھگڑا ہوتا تھا۔پھر عزت کا شرجیل کو منانا عزت جانتی تھی کہ وہ شرجیل احمد سے محبت کرنے میں نہیں تھی۔بلکہ اس عرصے میں ہونے والے جھگڑوں کو سلجھانے شرجیل کو منانے اور اس کے روٹھنے سے تھک گئی ہے۔ اب وہ شرجیل احمد کے فون کا انتظار بھی نہیں کرتی تھی۔ مگر وہ مطمئن تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کو ایک دوسرے کو وقت دینا چاہیے۔ محلے کی عورتیں اب شاید بار بار عزت کی شادی کا پوچھ پوچھ کر تھک گئیں تھیں۔ یا ایک ہی سوال بار بار پوچھ پوچھ کر خود ہی شرمندہ ہو گئیں تھیں۔ اب وہ ندرت بیگم کو زیادہ تنگ نہیں کرتیں تھیں۔ البتہ اب ندرت بیگم پریشان تھیں۔کہ اب شرجیل احمد فون کیوں نہ کرتا تھا۔ اس بار تو چھ ماہ ہونے کے قریب تھے۔ مگر شرجیل احمد کا کوئی فون نہ آیا تھا۔ مہتاب بیگم کبھی کبھار فون کرتیں تھیں تو بڑی آپا شرجیل احمد کی دوکان میں مصروفیت کا بتا کر بات ٹال دیتیں تھیں۔ انتظار حسین تو کسی بھی فکر سے بے نیاز تھے۔ گھر میں جو کچھ مرضی ہوتا رہتا وہ اپنی کتابوں سے نظر موڑ کر نہ دیکھتے۔ مگر ایک روز ندرت بیگم نے انتظار حسین کو اپنی پریشانی کا بتا کر انتظار حسین کو بھی کچھ فکر مند کر دیا۔

اسی لیے اس روز جب عزت کالج سے آئی تو رات کے کھانے کے بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں ہی بلا لیا۔ اس کی پڑھائی کا پوچھنے کے بعد انتظار حسین اس سے شرجیل احمد کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ "عزت تمہارے ساتھ شرجیل احمد کے رشتے کو ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تم دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو گئے ہو۔تم نہیں سمجھتی کہ اب تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے عزت خاموش بیٹھی رہی۔ انتظار حسین پھر گویا ہوئے۔ "عزت کیا تمہیں شرجیل احمد سے محبت ہے۔ عزت جو ایسے سوال پر اپنی دوستوں کے سامنے شرم سے سرخ ہو جاتی تھی باپ کے سامنے چہرے پر کتنی تاثر کے بغیر بیٹھی تھی۔" بابا مجھے لگتا ہے کہ وقت نے دھیرے دھیرے میرے اور شرجیل کے درمیان بہت بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ میں شاید شرجیل احمد کی محبت میں کبھی بھی گرفتار نہیں رہی۔ میری زندگی میں شرجیل احمد واحد مرد تھا۔ جو میری زندگی میں تب داخل ہوا۔ جب میری عمر کی ساری لڑکیاں رنگین خواب آنکھوں میں سجا رہی تھیں۔میں نے اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ اپنی زندگی میں کبھی کسی دوسرے مرد کے ساتھ اپنے کسی بھی طرح کے رشتے کو نہیں چکھا تھا۔ میرا نہ کوئی چاچا تھا۔ نہ ماموں نہ کوئی چچا زاد نہ کوئی خالہ ذاد اسلئے جب وہ میری زندگی میں داخل

ہوا تو میں Infatuation کا شکار ہو گئی۔ میں نے وہی کیا۔ جو اس نے مجھ سے کہا میں نے زندگی کو اس کی نظر سے دیکھا وہ کہتا ہے کہ محبت میں انسان اپنی ذات کو دبا کر محبوب کی ذات کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ مگر ابا جان اس نے کبھی اپنی ذات پر میری ذات کو ترجیح نہیں دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اور میں جو اپنی ذات پر اس کو ترجیح دیتی رہی۔ ایسا کر کے اپنے اندر ہمیشہ ایک دُکھ اور درد کو محسوس کرتی رہی۔ مجھے ایسا کرنا فرض نہیں قربانی ہی لگتا رہا۔ مگر ابا جان میں نے اپنی زندگی کے وہ چار قیمتی سال اس ایک شخص کو دیئے جن میں میرے ساتھ کی لڑکیوں نے زندگی کے رنگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کو پرکھا ان میں سے کچھ رنگ اپنے اندر شامل کیئے۔ بابا جان میں کبھی کسی اور مرد کو آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکی جب میرے ساتھ کی لڑکیاں مختلف مردوں کی آنکھوں کے رنگ الگ الگ پہچان رہیں تھیں۔ مجھے اب شاید شرجیل احمد کی عادت ہو گئی ہے۔ اور میں نے کہیں پڑھا تھا۔ ضرورت اور عادت کسی بھی دوسرے رشتے سے گہرے رشتے ہوتے ہیں۔ شرجیل احمد کی مجھے ضرورت ہے۔ وہ میرے قیمتی سالوں کا واحد سرمایہ ہے۔ میں اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر شرجیل احمد کو کچھ وقت چاہیے۔ ہمارے درمیان تعلق کو

صحیح طور پر جاننے کے لیے بابا جان آپ اماں بی کو سمجھائیں کہ وہ خالہ بی سے ہر دوسرے دن ایک ہی موضوع نہ چھیڑ دیا کریں۔ انتظار حسین بہت دھیان سے سر جھکائے اس کی باتیں سن رہے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ عزت کو بات کرتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان باپ بیٹی کے رشتے کا خیال آئے اور وہ کوئی بات کہتے ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔ اسی لیے وہ اپنی آنکھیں جھکائے بیٹھے تھے۔ عزت جب چپ ہوئی تو انتظار حسین نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ اور اب وہ کہہ رہے تھے عزت میں چاہتا تھا کہ تم ایک زرخیز زمین بنو۔ اور دیکھو آج تم بن گئی۔ خود آگہی بہت بڑی منزل ہے۔ آج تم جانتی ہو کہ تمہارے اٹھائے ہوئے کسی بھی قدم کی کیا وجہ ہے۔ وجہ معلوم ہو تو انسان مطمئن ہوتا ہے اور انسان کا ہر فعل اس کے مطمئن ہونے کی خواہش کے لیے رونما ہوتا ہے۔ انسان کی تمام کوششوں کا اصل ثمر اسکا مطمئن ہونا ہے۔ مگر بیٹا اس بات کا خیال رکھنا کہ ضروری نہیں کہ جس جگہ پر کھڑے ہو کر آپ چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا بھی آپ کے ساتھ وہی کھڑا چیزوں کو دیکھ رہا ہو۔ تم نے جو اپنے اور شرجیل احمد کے درمیان رشتے کو اپنے طور پر جانا ہے۔ ضروری نہیں شرجیل احمد بھی چیزوں کو ایسے ہی دیکھیں۔ دیکھو بیٹا زیادہ تر مرد کبھی پھیکے ہوتے رشتوں کے رنگوں میں تمیز نہیں

کر سکتے۔ عورت جس طرح دم توڑتی محبتوں میں سے گزرے پلوں کی یادوں کو چن چن کر نکالتی ہے۔ اور پھر ان کا حساب کتاب کرتی ہے۔ اگر ان یادوں میں وفا کے رنگ زرا بھی بے وفائی کے رنگوں سے گہرے ہوں تو وہ ان یادوں کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار دیتی ہے۔ مرد کبھی ماضی کی محبتوں کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا اس کی نظر ہمیشہ آگے کی طرف ہوتی ہے۔ عزت کی آنکھوں سے آنسو دھیرے دھیرے اس کی گالوں سے ہوتے ہوئے اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کی گالوں سے ہوتے ہوئے اس کی جھولی میں گر رہے تھے "بابا میں اس لائق بھی نہیں کہ جس شخص کو میں اپنی زندگی کا سرمایہ کہتی ہوں اس سے اتنی سی امید رکھ سکوں کہ وہ ذرا دیر رک کر ہمارے درمیان گزرے ہوئے پلوں کا حساب کتاب کرے۔ بابا میں شرجیل احمد کو نہیں کھونا چاہتی۔ مجھے اندازہ ہی نہیں کہ میں اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں ہمارے درمیان کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہو ا مگر کاش بابا کاش کوئی بڑا جھگڑا ہوا ہوتا کہ ہمارے پاس ایک دوسرے کو منانے کیلئے کوئی وجہ ہوتی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر ایک پہاڑ بن گئی ہیں اور ایسا پہاڑ جو نظر نہیں آتا۔ عزت انتظار حسین کی موجودگی سے بے نیاز مدھم انداز میں جیسے اپنے اور شرجیل کے درمیان تعلق کو نئے سرے سے کھوج

رہی تھی۔ انتظار حسین چپ چاپ اسے سن رہے تھے۔ انہیں عزت میں اپنی روح بولتی نظر آ رہی تھی۔ بیس پچیس سال پہلے جس رات انتظار حسین ندرت بیگم کے ساتھ لاہور میں راوی کے پانیوں کو چھوڑ کر ساہیوال آئے تھے اس شام کو وہ ایسے ہی عزت کی طرح گم صم باغ جناح کے ایک خاموش کونے میں جب سورج کسی کے غم میں کمزور اور زرد ہو رہا تھا اور جب پرندوں میں اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی ننھی جانوں کی فکر گہری ہوئے جا رہی تھی اور جب انتظار حسین کی آنکھوں کے سامنے صرف قدم ہی قدم تھے ادھر سے ادھر دائیں سے بائیں جاتے ہوئے قدم اس شام وہ بھی اسی طرح اپنے اور ندرت بیگم کے درمیان رشتے کو پرکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس رات اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کرنا تھا تو کیا عزت بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی؟

اس رات انتظار حسین سے بات کرنے کے بعد جیسے وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ شاید لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ ڈھیر سارا رونے سے دل کا غبار دھل جاتا ہے عزت ایک دفعہ پھر شرجیل کو منا کر ان کے درمیان پڑی گرہوں کو سلجھانا چاہتی تھی

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج کے بعد کبھی بھی شرجیل احمد کی کسی بات پر بحث نہیں کرے گی۔ بچپن سے وہ جو اچھائی اور نیکی کی چادر لپیٹ کر ندرت بیگم کے ساتھ چلی اور پھر شرجیل احمد کے مذہبی رجحان نے اس چادر کو اس کے چہرے اور پاؤں تک کو لپیٹ لیا اور اب وہ شرجیل احمد کی بنائی ہوئی اچھائی کی دنیا کے باقی سب رنگ اپنے اوپر چڑھانے کیلئے تیار تھی چاہے اس میں وہ خود فنا ہو جاتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شرجیل احمد اس کے قیمتی سالوں کا واحد سرمایہ تھا مگر ایک روز جب شرجیل احمد کا فون آیا تو عزت کچھ بھی تو نہیں بولی تھی وہ گم صم بیٹھے گھنٹوں اس کی بات سن رہی تھی نہ جانے کیا بات تھی جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ندرت بیگم جب دوپہر کو محلے میں کسی کی فوتگی کا افسوس کرنے جا رہی تھیں تو عزت برآمدے میں چارپائی پر فون رکھے شرجیل احمد سے بات کر رہی تھی " مگر جب وہ مغرب کی نماز کے وقت واپس آئیں تو عزت تب بھی اسی حالت میں ٹیلی فون سیٹ جھولی میں رکھے ریسیور کان کو لگائے گم صم بیٹھی تھی ندرت بیگم نے ہلکی آواز میں پوچھا بھی کیا بات کر رہا ہے مگر عزت نہ بولی دو تین بار پوچھے پر بھی جب عزت چپ رہی تو ندرت بیگم پاؤں گھسیٹتے گھسیٹتے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں مگر جب انہوں نے عزت کو ہاتھ لگایا تو وہ دھرام سے چارپائی پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

سے گر پڑی ندرت بیگم کو جیسے کرنٹ لگ گیا تھا ان کے چیخیں رک نہیں رہی تھیں عزت کا سارا جسم ٹھنڈا پڑا تھا اور اُس کی انکھیں پتھر کی تھیں جب انتظار حسین مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو ندرت بیگم کی چیخوں کی آواز سن کر وہ گلی سے دوڑتے ہوئے آئے تھے عزت کو یوں بے ہوش دیکھ کر انتظار حسین بھی کچھ دیر سکتے میں چلے گئے تھے۔ محلے کے کچھ حضرات نے عزت کو رکشے میں ڈالا تھا ہسپتال لے گئے تھے۔ عزت جب ہسپتال سے واپس آئی تو اس نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں ندرت بیگم اور انتظار حسین کو بتایا تھا " شرجیل احمد نے جس عورت سے شادی کی تھی خریم خریم احمد وہ واپس کسی جائز تعلق کے بغیر شرجیل احمد کے ساتھ پچھلے ایک برس سے رہ رہی تھی شرجیل احمد کہتا ہے وہ اسے پوری زندگی بھلا نہیں سکتا خریم سے شرجیل احمد کی ایک بیٹی بھی ہے وہ وہیں ریڈ ایریا میں رہ رہی ہے خریم کا پچھلے دنوں ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ مر گئی۔ شرجیل احمد کہتا ہے کہ وہ مجھے کبھی خریم کی جگہ نہیں دے سکتا مگر اگر میں چاہتی ہوں تو وہ مجھے اپنانے کو تیار ہے یہ کہتے ہوئے خریم کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا ندرت بیگم کے سینے میں جیسے کسی نے خنجر گھونپ دیا تھا انتظار حسین کی آنکھوں کے ستاروں کو عزت نے پھر سے بے نور ہوتے دیکھے ندرت بیگم کی آنکھیں اب خشک نہیں

ہوتی تھیں زندگی کو عزت نے اپنے آنگن میں رینگتے ہوئے دیکھا دن چڑھتا تو جیسے ختم ناں ہوتا مگر عزت کیوں نہیں روئی اس دفعہ انتظار حسین نے بھی اس سے نہیں پوچھا تھا شاید انتظار حسین کے اپنے غموں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کے غموں کو ٹٹولنے کی سکت نہیں رکھتے تھے کہیں اُن کے بوجھ بھی ان کے کندھوں پر نا آجائیں۔

آج پھر معمول کے مطابق سر سکندر شہاب وکٹورین پریڈ پر روشنی ڈالتے ہوئے بہت آ گے نکل گئے تھے۔ تھومس میتھیو آرنلڈ، جورج ایلیٹ، جورج میریڈتھ، تھومس ھارڈی اور والٹر پیٹر جیسی شخصیات کی زندگیوں کے تیے بانچے کرنے میں بہت گہرائی میں چلے گئے تھے تو پچھلی کرسیوں پر بیٹھی اس پری وش نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اُس میں سے ایک ببل نکال کر منہ میں رکھی، پھر ایک شیشہ اور برش بال سنوارے گئے۔ اور پھر ایک کپ گلوز وہ بہت اطمینان سے شیشہ ہاتھ میں پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے لپ گلوز اپنے باریک خوبصورت ہونٹوں پر ایک کے بعد دوسرا کوٹ کرتی جاتی اور آہستہ اہستہ سب لڑکے سر سکندر شہاب کی باتوں کے طلسم سے آزاد ہو تے جاتے اور اس پری وش کے ہونٹوں کی گلابیوں میں کھو جاتے ایم فل میں ہونے کی وجہ سے ہر ایک اپنے آپ کو میچور دکھانے پر مجبور

تھا ہر کوئی جانتا تھا کہ اب وہ عمر کے اُس حصے میں ہے جب انسان اپنے دماغ اور حرکات پر پورا کنٹرول رکھتا ہے۔ مگر ناجانے وہ پری وش کیوں بچگانہ حرکتیں کرتے ہوئے اپنی عمر بھول جاتی تھی۔ اور خاص طور پر اُس وقت ج ب سر سکندر شہاب اپنا زندگی بھر کا علم نچوڑتے ہوئے طالب علموں کو اتنا محسور کر چکے ہوتے کہ سانس سہنا دو بھر ہو جاتا اور اُس لمحے سب اُس کے اس بچگانہ حرکت میں اپنے اپنے حصے کا بچپنا شامل کرنے کے لیے ہنسی خوشی تیار ہو جاتا مگر وہ بہت لاپرواہی سے ان کی طرف ذرا سی توجہ دیئے بغیر لپ گلوز گہرا کرتی جاتی ایم فل کی کلاس کے پہلے روز جب سب اپنا اپنا تعارف کروا رہے تھے۔ اور لڑکوں نے اپنی شخصیت کی پختگی اور تجربے کو ظاہر کرنے کے لیے اپنے اصلی ناموں کے ساتھ اپنی ذاتوں اور ماسٹرز کے بعد کئی گئی نوکریوں اور اداروں کے ناموں کو بہت فخر سے جوڑا تھا
Sir I,m Sultan Sadiq waraich worked as a lecturar in university
اور لڑکیاں اپنے اور اپنے فیملی بیک گراونڈ رکے ساتھ سابقہ اداروں کو خوب ذوق و شوق سے اپنے تعارف میں شامل کر رہی تھیں Sir I'm Sadia Saeed from APC University ایسے میں پری وش جب اپنے لہراتے بالوں کو اک ادا کے ساتھ جھٹکا دے کر اٹھی اور پھر صرف اتنا کہہ کر کہ Sir, people call me

E.zee آرام سے بیٹھ کر بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی تو سب حیران نظروں سے اس کو دیکھنے لگے مگر وہ اطمینان سے اب کان سے موبائل لگائے کلاس سے باہر چلی گئی تھی۔

E-zee اصل میں ایم فل کی کلاس میں واحد وجہ مسرت تھی۔ سب کیلئے انگلش ایسے لہجے میں بولتی جیسے وہ abroad میں پلی بڑھی ہو شروع شروع میں لڑکیاں اس کی خوبصورتی اور بولڈ پن کی وجہ سے اس سے کتراتی تھیں مگر پھر اس نے خود ہی سب کو اپنی چھوٹی چھوٹی بچگانہ اور پُر خلوص حرکتوں سے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ لڑکے شروع میں اس کے بولڈ پن سے بہت متاثر ہوئے مگر پھر اس کے عجیب بچگانہ حرکتوں نے ان کو احساس دلایا کہ وہ بہت امیچور ہے اور ان کی عمر اور تجربہ ان کو ایسی لرکی کی بچکانہ حرکتوں سے دور رہنے پر اکساتا رہا مگر تیسری سٹیج پر ان کے خود کے اندر کا بچپنا E-zee کے لپ گلوز کے ساتھ کھیلنے لگا اب e-zee پوری کلاس کی جان تھی۔ اساتذہ اس کے اس بولڈ پن اور بے پرواہ انداز پر حیران تھے کہ وہ ایم فل میں کیسے پہنچ گئی اور پھر e-zee پوری کلاس میں انٹری ٹیسٹ اور اوور آل نمبرز پر سٹیج میں سب سے آگے تھی۔ وہ لیکچرز کو قدرے لاپرواہی سے سنتی مگر کبھی موڈ ہوتا تو بات سے ایسا نیا پہلو نکالتی کہ اساتذہ پورے

لیکچر میں اسی پہلو کو ڈسکس کرتے رہتے اور جب وہ پہلو کو ڈسکس کرتے ہوئے گہرائی میں پہنچ جاتے تو e-zee بڑے اطمینان سے اپنے بیگ سے شیشہ اور برش نکال کر اپنے بالوں کو سنوارنے لگتی اس وجہ سے اسے اساتذہ سے ڈانٹ بھی پڑی اور اسے کلاس سے باہر بھی نکالا گیا مگر اس پر جیسے کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ مگر سر سکندر شہاب نہ جانے کیوں اس کی ہر حرکت کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اور انہوں نے کبھی اسے نہیں ٹوکا تھا۔ شاید اسی لیے ان کی کلاس کے دوران e-zee کے لپ گلوز میں شامل بچپنا وافر مقدار میں ہوتا تھا e-zee ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہ کس شہر سے آئی تھی۔ رابیل اس کی روم میٹ کے سواہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاسٹل میں بھی وہ اپنے آپ ٹو ڈیٹ رہنے کی وجہ سے بہت جانی اور چاہی جاتی تھی۔ وہ کسی بھی کمرے میں بے دھڑک داخل ہو جاتی اور دوسروں کے کپڑوں اور تولیے سے لے کر نیل پالش اور لپ اسٹکس تک بغیر پوچھے استعمال کر لیتی مگر کوئی بھی اس کو کچھ نہ کہتا۔ ہاں پر ویک اینڈ کو وہ ایک رومانی انگلش مووی خرید لاتی اور پھر سب کو اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دے دیتی اس روز وہ e-zee کے پیسوں سے خریدی گئی کولڈ ڈرنکس اور ڈرائی فروٹس کے ساتھ موی دیکھتیں۔ ہاسٹل کی وارڈن نے شروع شروع میں e-zee کو بہت ڈانٹا اور اسے

ہاسٹل سے نکالے جانے کی دھمکی دی مگر وہ اکثر ویک اینڈ کی شاموں کو e-zee کے ساتھ بیٹھی خوش گوار موڈ میں دیکھی جاتی۔ ایم فل کی کلاس میں بمشکل سے پندرہ کے قریب طالب علم تھے اور اساتذہ زیادہ تر آسٹریلیا، انڈیا اور ناروے سے آئے ہوئے تھے ان میں بہت کم پاکستانی تھے سر سکندر شہاب بھی ان چند میں شامل تھے۔ آسٹریلیا سے حال ہی میں Ph.d کر کے آئے تھے۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ لیکچر دیتے ہوئے وہ طلبہ کو تاریخ کے مختلف ادوار میں سے اس طرح سے حوالے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو ان ادوار کے کردار تصور کرنے لگتے۔ باقی اساتذہ سے وہ اس لیے بھی مختلف تھے کہ وہ لٹریچر میں مذہب کا رنگ گھولنے سے اجتناب کرتے ہوئے غیر جانبدار رہتے تھے۔ وہ ان کو ناول پڑھاتے تھے اور ان کے اپنے دو ناول بھی چھپ چکے تھے طلبہ کے دماغوں کو کھولنا اور اس میں انفرادیت کے رنگ تلاش کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔وہ ہمیشہ فرد کی آزادی پر زور دیتے تھے اور شاید فرد کی رائے کو معاشرے کی رائے پر فوقیت دیتے تھے۔ مگر E-Zee نے ان میں ایک مضطرب روح کو پہچان لیا تھا۔ وہ اکثر کہتی کہ سر اپنے کچھ خیالات میں In-Consistant ہیں اس نے ان کو بہت سے نام دے رکھے تھے کبھی وہ ان کو چوکلیٹ ہیرو کہتی کبھی "بدھا" کہتی

جس نے معاشرے کو ترک کرکے انفرادیت کا جوگ لے لیا تھا۔ اور کبھی وہ انہیں میکولی کا چیلا بلاتی اس روز بھی جب سر سکندر شہاب وکٹورین پیریڈ کی نثر کو بیان کرتے کرتے دور نکل گئے تھے اور E-Zee نے اپنا شیشہ اور لپ گلوز نکال لیا تھا تو اس کے ڈھکن کو کھولتے ہوئے E-Zee نے سنا وہ کہہ رہے تھے۔ "ہم برائی اور اچھائی کو کسی پیمانے سے نہیں ماپ سکتے۔ برائی اور اچھائی کا انحصار پیش آئندہ واقعات اور مخصوص حالات پر ہوتا ہے جس میں فرد کی انفرادی فطرت کے بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ کوئی شخص اچھا یا برا نہیں یہ حالات ہیں جو اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ ہم حالات اور فطرت کو پس نظر رکھ کر کسی کی شخصیت کے بارے میں حتمی رائے نہیں دے سکتے وہ اب ایک ناول Mill on the floss کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے تاریخ میں maggi جیسے بہت سے انفرادی شخصیت رکھنے والوں کا خون ہوا ہے۔

e-zee نے لپ گلوز بند کر کے واپس بیگ میں رکھ دیا تھا اور اب اپنے گلے میں پہنی لمبی مالا سے کھیلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی "ایکسکیوز می سر آپ پلیز یہ واضح کریں گے کہ ایسا شخص جو برائی اور اچھائی کے درمیان بٹا ہو اس کی ذات میں اچھائی کا عنصر گہرا ہو۔ مگر اس کے حالات اسے برائی کا راستہ اختیار کرنے پر

اکسائیں تو اس صورت میں حالات سے نظریں چراتے ہوئے اپنی ذات کی آواز سننا نیکی ہو گی یا گناہ؟ سر سکندر شہاب اس دوران بہت گہری نظر سے پری وش کو دیکھ رہے تھے اور سب جانتے تھے کہ ایسا کرتے ہوئے سر سامنے والے بندے کے لاشعور تک کو پڑھ لیتے تھے۔ اب وہ پر اسرار انداز میں مسکراتے ہوئے e-zeeکی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ وہ e-zee کے بالکل پہلو میں جا کھڑا ہوئے تو انہوں نے ایک بار پھر اسے بڑے غور سے دیکھا تھا اور پھر وہ واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔

ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ وہ e-zee کے بالکل پہلو میں جا کھڑا ہوئے تو انہوں نے ایک بار پھر اسے بڑے غور سے دیکھا تھا اور پھر وہ واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔

جس شخص کے فطرت اور حالات برائی میں ڈوبے ہوئے ہوں اس کا برا عمل مکمل گناہ نہیں ہو سکتا۔ حالات اگر برائی کی فطرت رکھنے والے فرد کو برائی کی طرف بلائیں۔ اور پھر وہ اپنی فطرت کو دباتے ہوئے اچھائی اختیار کر لے تو ایسا عمل اصل

میں نیکی ہے۔ اسی طرح ہم کسی اچھائی کی فطرت رکھنے والے فرد کے کسی اچھے عمل کو مکمل نیکی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ عمل اس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کہا۔ ہم عادتوں یا فطرتوں کو اچھا یا برا نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو انسان کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہ مسلسل کیے جانے والے عملوں کا نام ہے جو انسان کی پہچان بن جاتے ہیں۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے۔ سر سکندر شہاب کی یہ عادت تھی کہ وہ پوچھے گئے سوال کا فوراً جواب نہیں دیتے تھے بلکہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس کی طرف آتے تھے۔ اور ان کی بات مکمل ہونے تک سوال جواب آدھے سے زیادہ واضح ہو جاتا تھا " حالات کے پیدا کیے ہوئے راستے اختیار کرنا یا ان سے منہ موڑنا انسان کی فطرت پر منحصر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کر لے اسے ہم مکمل نیکی یا گناہ نہیں کہہ سکتے مگر آپ کے سوال سے کچھ بغاوت کی بو آتی ہے۔ پری وش ایک دفعہ پھر اٹھی تھی۔ جی سر آپ اسے بغاوت کا نام دے سکتے ہیں مگر کچھ لوگوں کے لیے یہ بغات نہیں ایک حقیقی اور عام فہم چیز ہے مگر .... مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی سر سکندر شہباب نے اسے ٹوک دیا تھا۔ امس E-zee اگر آپ اپنی ذات سے متعلق کسی سوچ کو اپنے لیے عام فہم سمجھتی ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسرے بھی

اس کو اتنا ہی عام فہم سمجھیں کسی نے مخصوص نا کیا تھا کہ ابھی ابھی انفرادی رویوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے والا شخص کیسے یوں معاشرتی اقدار کی پٹڑی پر چل پڑا کہ عزت کی انفرادی سوچ کو معاشرتی سوچ کے لیے بغاوت کا رنگ دینے لگا ہاں واحد عزت تھی جو جانتی تھی۔ سر اپنے خیالات میں In Consistant تھے۔

آپ مجھے اپنی کلاسز کے بعد فیکلٹی روم میں مل سکتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی گاڑی کی چابی اور بیگ اٹھا کر کلاس سے باہر نکل گئے۔ پریڈ ختم ہو چکا تھا۔

راوی کتنی اداس اور میلی کچیلی ہوگئی تھی۔ صحیح کہا جاتا ہے کہ اگر دیکھنے والی آنکھ ہی نہ ہو تو ہیروں کے حسن میں گرہن لگتے لگتے ہیں۔ راوی کے رانجھے بھی کہیں کھو گئے تھے۔ اور وہ میلی کچیلی ہو گئی تھی۔ اس نے بننا سنورنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب بھی کوئی جوگی پرانی کمزور ہڈیوں میں حرارت تلاش کرنے آہی جاتا تھا۔ اس کے جھری زدہ چہرے کو جی بھر کر دیکھتا تھا اور شاید راوی اسے ماں سی نظر آتی تھی۔ بوڑھی کمزور مگر محبت سے بھری ہوئی محبوب کیا کیا روپ دھارتا ہے عاشق کی نظر میں کبھی ایک وہم، کبھی ایک خیال، محبوب کا شباب، ایکھوئی ہوئی یاد یا ایک با وفا بیوی اور پھر محبتیں پر خلوص ہوں تو ایک محبت بھری ماں۔ راوی اس روگی کے لئے اب ایک ماں تھی جس کی محبتوں نے بدلے میں اس سے کچھ نہیں

مانگا تھا۔ اس کے رانجھے اب بہت امیر کبیر بھی ہو گئے تھے اور وہ اب بھی پھٹی پرانی کٹیا میں بیٹھی تھی۔ اور پھر بھی ان کی سلامتی کی دعائیں کرتی تھی ہاں راوی اب ماں ہی تو بن گئی تھی اور پھر وہ مراقبے کی حالت میں گم راوی کے نزدیک درختوں کے جھنڈ میں چلا جاتا جہاں راوی اسے مکمل شباب میں ملتی۔ وہاں وہ روزانہ یوگا کرنے آتی تھی۔ ہاں وہ ماڈرن ہو گئی تھی۔ جب سے اس جوگی سے ملی تھی۔

آج بھی جب وہ رانجھا مراقبے میں ڈوبا ہوا اس کے پاس آیا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ " تو ہو آئے آپ اپنی ہیر کے پاس سے؟ " ہاں ہو آیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا مجھ پر بہت احسان ہے اگر تم مجھے یہاں اس کے پاس نہ لے کے آتی تو شاید میں اس کے وہموں میں ساری زندگی گزار دیتا اب وہ میرا وہم نہیں رہا بلکہ وہ حقیقت بن گئی ہے۔ " وہ ہنس رہی تھی اور اس کی ہنسی میں راوی کی ٹھاٹھیں مارنے والے پانی کی جھنکار تھی۔ ہاں وہ پورے شباب پر تھی۔ تمہیں پتہ ہے میرا دل کرتا تھا کہ اس دنیا سے کہیں بھاگ جاؤں کہیں دور چلا چلاؤں مگر اب میں اسی ایک کونے میں بیٹھ کر پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں وہ ایک بار پھر ہنسی تھی آپ جہاں بھی جاتے اپنے آپ کو اپنے ساتھ لے جاتے اور آپ کی اداسی کبھی ختم نہ ہوتی۔ " ہاہاہا .... وہ پھر ہنسی رہی تھی " ہاں یہ تو میں

نے سوچا ہی نہ تھا تو کیا میرا وجود اتنا اہم ہے۔ " ہاں آپ ہی تو ہیں۔ آپ ناں ہوتے تو یہ راوی بھی نہ ہوتی " ہاہاہا .... مگر میں اپنے وجود کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ خدا بھی تو ہے اگر میں ہوں تو پھر خدا؟ اس نے ہنستے ہوئے اس کا بازو پکڑا تھا۔ آئیں میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں آئیں ہاہاہا آئیں یہاں ہی ہے آئیں آئیں ہاہاہا وہ بھاگ رہے تھے اور اب وہ جوگی کے گرد پیچھے سے بازو حائل کیے کسی چیز کی سمت اشارہ کر رہی تھی وہ دیکھیں وہ .... اس نے ہاتھ پکڑ کر اس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ دیکھیں راوی کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے ہاہاہا اور واقع ہی راوی ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ اس کے پانی میں دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور اب وہ شرارت سے اس پر پانی پھینکنے لگی تھی اور پھر وہ بھی اس کے کھیل میں شامل ہو گیا وہ دونوں بھیگ گئے تھے سر سے پاؤں تک وہ ہنسے جا رہی تھی ہاہاہاہا .... ہاہاہاہا

....

لمبی سڑک پر دھند کیسے ہولے ہولے بہت دھیرے دھیرے برس رہی تھی اور کبھی سڑک کی یخ پڑی سطح سے ٹکرا کر پھر اوپر اٹھ رہی تھی رات کسی کے ہجر میں بہت روئی تھی شاید اسی لیے ساری سڑک پر دونوں طرف کھڑے دیوہیکل درخت سڑک کی سطح پر بکھرے رات کے انمول آنسوؤں کو دینا سے چھپا رہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

تھے۔ شہر سے بہت دور یہ سڑک کھیتوں کے بیچوں بیچ بہت دور تک نکل جاتی اور پھر جب شام ہوتی تو کسی خاموش اور اُداسی شام میں گھل جاتی تھی۔ بچھڑنے والوں کے لیے یہ ایک پر امید فراق کی نوید ہوتی تھی اور ہر شام ہی یہاں سے عجیب بے رونق آنکھیں لیے ہوئے دو پنچھی گزرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود کہیں بہت دور الگ الگ منزلوں کی سوچ میں ڈوبے ہوئے لگتے تھے اور اب تو تمام پرندے اپنے اپنے گھر جانے سے پہلے ان دو پنچھیوں کا انتظار کرنے لگے تھے وہ جب وہاں سے گزرتے تو پرندوں کے درمیان بحث چھڑ جاتی۔ فاختہ کہتی ان دونوں میں جو ایک ہے جو آگے والے کے پیچھے ہے وہ کسی کے انتظا ر میں سلگ رہی ہے۔ محبت کے خمیر میں گندھی ہے میں بھلا محبت کی جہتیں میں نہ سمجھوں گی تو بھلا کون سمجھے گا۔ فاختہ ہی وہ پہلی تھی جو بحث کا آغاز کرتی تھی اور پھر آوازیں آپس میں گڈ مڈ ہونے لگتیں چڑیا! ہدہد، کوئل، اُلو، ابابیل اور آخر میں عقاب اپنی آنکھوں کو سکیڑ سکیڑ کر اپنی دانشمندی اور تجربے کو چند لفظوں میں سمیٹتے ہوئے کہتا " وہ جو پیچھے والے کے آگے ہے اسے پیچھے والے کی ضرورت نہیں اور پیچھے والا آگے والے کا سہارا لینے کی کوشش میں ہے اس کی اَنامجروح ہوتی ہے وہ اب کسی ایسے کی تلاش میں ہے جو پیار و محبت سے اسے

عاجزی سکھائے۔ اور اس کی اَنا کو مجروح کیے بغیر اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دے اَنا اور اکیلے پن کو بھلا میرے سے زیادہ کون سمجھے گا .... آج پھر وہ وہاں سے گزرے تھے۔ ہیوی بائیک پر بیٹھے وہ ایک دوسرے سے بے نیاز آگے کی طرف جھکے ہوئے بے نور آنکھوں سے مختلف سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور پرندوں کے درمیان ایک دفعہ پھر بحث چھڑ گئی تھی اور کچھ ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد اپنے گھر جانے کے لیے پر پھیلانے لگے تھے۔ وہ دونوں یہاں سے ہر شام گزرتے تھے مگر ان پرندوں سے بھی دور جب رات کی سیاہی شام کے سانوے پن کو گھیرنے لگتی تب وہ جو پیچھے بیٹھی تھی زور زور سے ہنسنے لگتی اور وہ جو آگے بیٹھا تھا اس کے قہقہوں میں اس کا ساتھ دیتا تب ہی وہ اپنا ڈوپٹہ اتار کر آزادی اور خوشی کے اظہار کے لیے ہواؤں میں لہرانے لگتی۔ کبھی پیچھے کی جانب کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی وہ اپنی بکھری ریشمی زلفوں کو ڈوپٹے کے آنچل سے ڈھانپ لیتی پھر وہ شرارت سے ڈوپٹے کو آگے بیٹھے ہوئے کے گرد لپیٹ دیتی ہاہاہا ....ہاہاہا..................

اور جب ہی وہ رات کی گود میں ایک ننھے ستارے کو دیکھ لیتے وہ جو آگے بیٹھا تھا بائیک کو زور دار جھٹکے سے روک لیتا۔ اور پھر وہ دونوں سڑک کے درمیان میں

ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ان کے دونوں جانب آگے اور پیچھے میں میلوں تک سڑک خالی ہوتی اور تب ہی وہ گھنی زلفوں اور خوبصورت آنکھوں والی اپنے دونوں بازو کھول لیتی اور زور سے چلانے لگتی۔ " مجھے اپنے گناہ کی دنیا میں شامل کر لو ہاں میں تمہاری گناہ کی دنیا میں قید ہونا چاہتی ہوں۔ " مجھے اپنی گناہ کی زندگی میں شامل کر لو اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگتے ہاہاہا .... ہاہاہا

آج وہ جوگی راوی کی پلکوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی وہ پلکوں کو اپنے ہاتھوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے انہیں ہولے ہولے دباتا۔ اور کبھی ان کو اس کی گہری آنکھوں پر بند کر دیتا اور کبھی اپنے منہ سے ہلکے ہلکے پلکوں پر پھونک مارتا اور پلکیں لرزتے ہوئے اوپر نیچے ہوتیں۔ تمہاری آنکھوں کا رنگ بالکل سیاہ ہے ناں؟ ہاں میرے بابا کی آنکھیں بھی ایسے ہی سیاہ تھیں۔ "" ویسے میں تمہارے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔ " اور وہ ہنسنے لگی ہاہاہا " .... آپ کو پتہ ہے میں بھی اپنے بابا سے ملنا چاہتی تھی۔ ان کے وجود سے کوئی مل ہی نہیں پایا اور وہ تنہا ہی جیتے رہے ہاہاہا اور پھر وہ مر گئے بالکل تنہا کسی سے ملے بغیر ہاہاہا امیرے وجود کے تنہا پن نے ان کی تنہائی کو اور زیادہ گہراہ کر دیااور وہ چلے گئے .... اس بار وہ ہنسی نہیں تھی تو کیا انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چلا جائے؟ " ہاں کیوں نہیں

انسان جب تنہا ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے اور میرے بابا تو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے اور کچھ لوگ ایک ہی کام روز روز کرکے مر جاتے ہیں۔ روز ایک ہی کام دن سے رات اور پھر رات سے دن آجکل تو ہر انسان مرا ہوا ہے۔ آپ نے وہاں شہر کے بیچوں بیچ بڑے پل پر کھڑے ہو کر جہاں ہم دونوں روزانہ بابا کریم بخش سے چائے پیتے ہیں وہاں لوگوں کو غور سے نہیں دیکھا سب مر گئے ہیں انسان مرتا تب ہی ہے ناں جب وقت اس کے لیے رُک جائے تو ان لوگوں کے لیے وقت رک گیا ہے آپ نے حسیب صاحب کو نہیں دیکھا؟ان کو مرے ہوئے چالیس سال گزر گئے وہ چالیس برس سے ٹھیک آٹھ بجے گھر سے نکلتے ہیں اور پھر پورا دن پیسے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور رات کو واپس اپنی قید میں چلے جاتے ہیں۔ پورے گیارہ بجے اور اس وقت دنیا میں ہر شخص وقت مقررہ پر ہر چیز نمٹا کر اپنی اپنی قبروں میں چلے جانے کی تیاریوں میں مصروف نظر آتا ہے ”کیا میں بھی مرا ہوا ہوں میری راوی کیا مجھ میں بھی تمہیں کوئی زندگی نظر نہیں آتی؟ “ وہ اب پھر ہنس رہی تھی اور ہنستے ہنستے اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اب وہ اس کے چہرے کے زاویوں کو اپنی انگلی کے لمس سے چھو رہی تھی۔ ماتھے سے ناک اور پھر واپس آنکھوں پر اور پھر دایاں گال اور پھر ہونٹ اور پھر ٹھوڑی ” آپ

میں پھر سے جی اٹھنے کی امید نظر آتی ہے مجھے۔ آپ مر کر جی اٹھنے کی تڑپ رکھتے ہیں۔ “ ہاہاہا اور پھر وہ پھر سے گویا ہوئی ” مگر آپ کو پتہ ہے میں کیسے مری میں بھی اپنا بابا جیسی تنہائیوں سے مری یہ تنہائیاں آپ کو ورثے میں ملتی ہیں۔ میرے بابا جب پیدا ہوئے تو تنہائیاں اور خلائیں ان کے ساتھ پروان چڑھیں اور پھر میں نے یہ تنہائیاں ان سے ورثے میں لے لیں۔ یا انہوں نے اپنی تنہائیاں ختم کرنے کے لیے مجھ جیسے تنہا وجود کو جان بوجھ کر پیدا کیا تاکہ ان کی تنہائیاں تنہا نہ رہیں۔ مگر میرے وجود کی تنہائیاں اور خطائیں جب جوان ہوئیں تو وہ بابا کے بوڑھے وجود سے کوئی رغبت حاصل نہ کر سکیں اور تب میں نے ایک جوان وجود کا سہارا لیا۔ اسے اپنے خون سے سینچا اسے اپنی زندگی کے انمول سالوں میں پروان چڑھایا اور جب مجھے اس کی عادت ہو گئی تو اس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ....میں مر گئی اور اب میں جینا نہیں چاہتی مجھ میں ہمت ہی نہیں اور میں چاہتی ہوں آپ بھی میرے ساتھ ایک ہی قبر میں پڑے رہیں۔ وہ اب اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور تب اس نے جواب میں کچھ نہ کہا اور ہنسنے لگا تھا۔

ہاہاہا .... ہاہاہا

راگنی کے پاؤں ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ پاؤں کے گھنگرو شوخی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے کمر کے بل اس وقت اور زیادہ انگڑائیاں لیتے محسوس ہوتے جب سامنے بیٹھے شائقین کی پر تپش آنکھوں میں سے وہ اپنے لیے ستائش کے جگنو جلتے بجھتے دیکھنے کے لئے ان کے نزدیک جاتی " جستجو جس کی تھی اس کو تو نا پایا ہم نے .... اس بہانے سے مگر دیکھ لئی دنیا ہم نے " جوگی اور راوی آج راگنی کو مدہوش قدموں کے ساتھ جھومتے دیکھنے آئے تھے جوگی نے وہاں بیٹھے بیٹھے ناجانے کتنے سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ شائقین میں سے اکثر نے بیشتر بار اس کو روکنا چاہا تھا کہ رنگ و بو کی محفل میں بھلا سگریٹ کا کیا کام مگر جیسے ہی کوئی شخص آنکھوں میں غصہ بھرے اس کی طرف بڑھتا راگنی کمر بچکاتی، بل کھاتی اس کے راستے میں آکھڑی ہوتی اور وہ دوبارہ اپنی جگہ پر مدہوش گر جاتا جوگی نے راوی کو بتایا تھاکہ وہ اکثر راگنی کے پہلو میں اپنا غم ہلکا کرنا آتا رہا ہے۔ اور آج راوی راگنی کو دیکھنے آئی تھی راگنی خوبصورت تھی، دراز قددر گوری چٹی صراحی گردن، بل کھاتی کمر والی۔ اس کی آنکھوں میں جو چیز راوی کو نمایاں لگی وہ جوگی کی چاہ میں انتظار کرتی چمک تھی راوی نے وہ چمک تھیں دیکھی جب راگنی محفل کے ختم ہونے پر ان کے پاس آئی تھی " بہت دیر کر دی تو نے مہربان آتے آتے

"راگنی نے بہت بے تکلف انداز میں جملہ جوگی کے شانوں پر اپنا بازو ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔ جوگی نے مسکراتے ہوئے اس کا بازو اپنے شانوں سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ "اب اس مہربان کو اپنے لیے کسی مہربان کی ضرورت پڑ گئی ہے راگنی نے ایک دم سے گردن موڑتے ہوئے راوی کو دیکھا تھا اور راوی نے ایک ثانیے میں راگنی کی آنکھوں میں اندیشوں کے اتنے رنگ دیکھے کہ وہ گھبرا کر ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی وہ جانتی تھی انتظار کسے کہتے ہیں۔ اس کے بابا نے اس کو اپنا جیسا تنہا وجود بنانے کے لیے بیس سال انتظا کیا تھا انتظار میں روح انسان کے وجود کے اندر گوشت پوشت کے پورے ڈھانچے کے اندر ایک جگہ ایک کونے میں آتی پالتی مارے کسی گیان کے ملنے کی چاہ میں پورے جسم سے بے خبر ہوئے بیٹھے رہتی ہے پھر چاہے ہزاروں پر زور رہا تھی اسکے اوپر سے گزر جائیں وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتی اور انسان اپنے باقی بے جان جسم کے ساتھ زندگی کے ان تمام روپوں کے ساتھ ملتا رہتا ہے جن کا انتظار اس نے کبھی نہ کیا تھا اور وہ بن بلائے بن چاہے اس کے پاس چالے آئے تھے۔ انتظار کی کیفیت میں جب کوئی صور پھونکنے والا صور پھونکتا ہے اور روحیں جسم سے الگ ہوتی ہیں کسی گیان کو حاصل کیے بغیر تو اس سے زیادہ قابل رحم حالت کیا ہو گی جوگی نے راگنی کے کانوں میں صور پھونک دیا تھا۔

وہ اَب جوگی کو پکڑے اُسے روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بھولی تھی کہ جوگی اس کے پاس بہت دیر پہلے ہی جا چکا تھا۔کسی کو سامنے بٹھا کر اس کو پا لینے کی آرزو کرنا کسی کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے پہلو کی چاہ کرنا بڑا عجیب ہو تا ہے جوگی اور راوی اَب باہر معطر بازاروں میں ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے ارد گرد سے بے نیاز سامنے کی طرف دیکھتے خاموش چلتے ہوئے جا رہے تھے۔ "جوڑی سلامت رہے بابو جی "کوئی ان کے سروں پر پیار دیتے ہوئے گزر گیا تھا معطر بازار ختم ہو گیا تھا رات کے 2 بج رہے تھے تب ہی راوی ہنسی تھی ہاہاہاہا۔ جوگی بھی ہنس رہا تھا۔ ہاہاہا۔ مگر پھر ہنستے ہنستے رُک گیا تھا۔ "کتنی بے جان ہنسی ہے نا ہماری ذرا بھی تو جان باقی نہیں۔" راوی چلتے چلتے ایک دم رُکی تھی اور اب وہ جوگی کا راستہ روکے اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ "ہنسی ان دو انسانوں کے بیچ کبھی بے جان نہیں ہوتی جن کی روحوں پر وقت نے گہرے زخم لگائے ہوں۔ کھونے اور پا لینے والی چیزیں دو مردہ وجودوں کے لیے یکساں ہوتی ہیں آنسو اور قہقہے دو بے جان وجودوں کے درمیان کبھی غیر معنوی نہیں ہو سکتے جوگی میری ہنسی کو مکمل کر دو کرو گے ناں؟ وہ اَب جوگی کے شرٹ کے اوپری بٹن کے ساتھ کھیل رہی تھی جوگی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے اُس کے

ہاتھوں کو پکڑ کر اس کو خود سے دور کر دیا وہ ایک بار پھر خاموش سڑکوں پر پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ سٹریٹ لائٹس کی پیلی روشنی میں ان دونوں کے علاوہ کبھی کبھار کوئی گاڑی زون کی آواز کے ساتھ گزرتی تو ماحول کی سکونت میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہو تا۔ مگر پھر جوگی بولا تھا۔ "راوی میں نہیں چہاتا تمہاری آنے والی نسل تمہارے کسی انجانے میں اُٹھائے ہوئے کسی قدم کی سزا کاٹے میں تمہارے سے متعلق ہر شے کو زمانے کی دُھول سے بچانا چاہتا ہوں ناں جانے کیوں مگر میں تمہیں زمانے کی دھول سے بچانا چاہتا ہوں۔ "کیسی دھول؟ کیسی سزا؟ " راوی بولی تھی راوی یہ وقت بڑی عجیب شے ہے انسان سمجھتا ہے کہ یہ آگے کی طرف بڑھ رہا ہے مگر تمہیں معلوم ہے یہ ایک ہی دائرے کے گرد گول گول گھوم رہا ہے بار بار ایک ہی مرکز کے گرد گول گول مگر جب انسان ایک چکر مکمل کر کے واپس اسی جگہ آتا ہے تو اس کی آنکھیں زمانے کی گرد سے اس قدر دھندلا چکی ہوتی ہیں کہ اسے مخصوص جگہ کی پہچان نہیں ہو پاتی وقت نہیں بدلتا انسان بدل جاتا ہے میں نہیں چاہتا جس طرح بیس سال بعد انتظار حسین نے اپنے سامنے اپنے جیسے وجود کو کھڑا پایا اس کی بغاوت تم میں در آئی ہیں نہیں چاہتا کہ تمہاری بغاوت تمہارا اس معاشرے کو دیا ہوا کوئی دھوکہ مستقبل میں تمہارے سامنے آ کھڑا ہو

راوی میں بھی تمہاری طرح انفرادیت کو معاشرے پر ترجیح دیتا تھا۔ مگر میں غلط تھا معاشرتی اقدار میں انفرادی رنگ کوئی اہمیت نہیں رکھتے انہیں ختم ہی ہونا ہاوتا ہے۔ جوگی کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ " دھوکہ کبھی اپنے مالک کا ٹھکانہ نہیں بھولتا۔ "مگر راوی کے سامنے بہت سے ایسے واقعات ایک فلم کی طرح ایک کے بعد ایک چلنے لگے جوگی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا انور حسین جو ایک استاد تھے اپنی بیوی کے ساتھ ہمیشہ ظلم و زیادتی کرتے رہے اسے پیٹتے رہے انہوں نے کسی کی بیٹی کے ساتھ پوری زندگی مار پیٹ کی اور بڑھاپے میں عاصمہ ان کی بیٹی کو اس کے سسرال میں آگ لگا کر جلا دیا گیا۔ فاروق صاحب پوری زندگی معصوم عورتوں کی عصمت سے کھیلتے رہے۔ انہیں دھوکہ دیتے رہے بڑھاپے میں ان کی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی عفت بیگم ناجانے راتوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے نانا کے پاس چھوڑ کر کہاں چلی جاتی تھی ریحانہ ان کی بیٹی پندرہ سال کی عمر میں ہی اپنی ماں کے گھر سے باہر جلائے گئے دیوں کی روشنی بڑھانے کے لیے تیل ڈالنے جانے لگی تھی ان کے بیٹے نے بارہ سال کی عمر میں ہی بلوغت کا سفر طے کر لیا تھا۔ " میں نہیں چاہتا تم اپنے لیے کوئی برا بیج بو۔ اور تمہیں پتہ ہے ناں تم گناہ کی زندگی نہیں گزار سکتی؟ تم گزاری ہی نہیں سکتی۔ ہاہاہا .... ہاہاہا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

مجھ جیسا شخص جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا ہو اور جس کا باپ زندگی میں صرف ایک خواہش رکھتا ہو کہ اس کا بیٹا دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں پڑھے بہترین معیار زندگی کو حاصل کرے اپنی زندگی کے چالیس سال گزارنے کے بعد جب اس نے آدھے سے زیادہ دنیا گھوم لی ہے دنیا کی بہترین اداروں سے ڈگریاں لینے کے بعد ایسا بے رونق اور مردہ ہو جائے گا کس کو خبر تھی۔ راوی میں نے اپنی زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا۔ سب کچھ کر لیا اب کچھ کرنے کی چاہ نہیں پھر زندگی ختم کیوں نہیں ہوتی؟ وہ آج کراچی کے ساحل پر ہجوم سے دور جہاں پانی ان کے ٹھنوں سے اوپر آگیا تھا۔ دو زانوں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے میں ایک Shattered Personality ہوں زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی جستجو نہیں ہے مجھے مجھے۔ خواہش ختم ہو جائے تو جینے کا کیا مطلب راوی؟ وہ بہت خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور پانی کی لہروں سے نیچے موجود ریت پر انگلی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھی جب اس نے اس کی بات کا جواب نہ دیا تو " آہا " وہ ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا ایک وقت تھا جب میں بدن کی پیاس میں مارا مارا پھرتا تھا میں نے لاتناہی سمندر خالی کردیئے مجھے نیلی آنکھوں کے پانیوں اور لمبی خوشبودار باہوں میں راحت ملتی تھی میں ناجانے کتنی صدیاں ان کی آغوش

میں مدہوش پڑا رہا اور جب مجھے ہوش آیا تو میرا سب کچھ لٹ گیا۔ انہوں نے میرے اندر یقین اور ایمان کی حرارت کو اپنے جذبات کی حرارت سے عاری ٹھنڈے بدنوں سے ختم کر دیا میری روح کو میرے وجود سے الگ کر دیا میری نابالغ آنکھوں کو وقت سے پہلے بالغ کر دیا ہاں تب میں صرف پندرہ سال کا ہی تو تھا۔ جب بابا نے مجھے اولیول کے لئے امریکہ کے بہترین سکول میں داخل کروایا تھا۔ میں اس وقت کچا گھروندا تھا جس کو ہلکی سی ضرب دے کر توڑ موڑ کر اپنی من چاہی شکل میں ڈھالا جا سکتا تھا۔میں ان کے سارے رنگ ایک کے بعد ایک کرکے اپنے اوپر چڑھاتا گیا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں اپنی کلاس میں ڈرپوک اور ناسمجھ سمجھا جاتا تھا۔ ناتجربہ کاری کا داغ میرے ماتھے سے مٹانے کے لیے میری واحد پر خلوص دوست جوزف نے مجھے ایک ایسا راستہ دکھایا جس نے مجھے " سمجھ دار " اور " تجربہ کار " بنا دیا ب میں بھی اپنے ہم عمر ساتھیوں میں باشعور تصور کیا جانے لگا۔ میں بھی ان کی طرح دوشیزاؤں کے لئے " قابل بھروسہ " ہو گیا تھے مگر ابھی بھی مجھ میں مشرقیت کہیں کہیں سے جھانکتی تھی قابل بھروسہ ہونے کے ساتھ ساتھ میں ہمیشہ مجنوں کی شکل اختیار کر لیتا۔ جس پر میرے دوست میرا بہت مذاق اڑاتے اور پھر آہستہ آہستہ یہ پرچھائیاں بھی ڈھل گئیں۔ میں حَوس کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

سیاہیوں میں دفن ہو گیا اور ان سیاہیوں نے میرے چہرے کو میری ہی نظر میں اجنبی کر دیا۔ تیس سال تک میں کسی کے چہرے کے ساتھ پوری دنیا پھرتا رہا اور میری روح بھی سیاہ ہو گئی اور تب ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے جب میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو میں اپنے آپ کو دیکھ کر ڈر گیا۔

اس رات جس کال گرل کو میں اپنے ساتھ لایا تھا وہ کوئی مسلمان عورت تھی میں سمجھا وہ بھی میری طرح بدن کی قید میں بند ہے۔ صبح میری آنکھ تب کھلی جب وہ عورت جائے نماز پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ " مسلمان مردوں سے کہو اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہی ان کے لئے پاکیزگی ہے۔ لوگ جو کچھ کریں اللہ اس سے خبردار ہے۔)" سورۃ نور : ۰۳ (

اس رات جس کال گرل کو میں اپنے ساتھ لایا تھا وہ کوئی مسلمان عورت تھی میں سمجھا وہ بھی میری طرح بدن کی قید میں بند ہے۔ صبح میری آنکھ تب کھلی جب وہ عورت جائے نماز پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ " مسلمان مردوں

سے کہو اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہی ان کے لئے پاکیزگی ہے۔ لوگ جو کچھ کریں اللہ اس سے خبر دار ہے۔"(سورۃ نور : ۳۰)

ہاں اس دن جب میں نے اپنا چہرہ دیکھا تو ڈر گیا میں وہاں سے بھاگ اٹھا اپنے وجود کو میں نے بہت دفعہ رگڑرگڑ کر دھویا مگر یہ سیاہی نہ اُتری۔ میں نہ جانے کیوں راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیز دھار چھری سے اپنے وجود کی اوپری تہوں کو کھرچتا رہا مگر وہ سیاہی نہ اتری۔ راوی برائی میری عادت او ر فطرت بن چکی ہے اور میں چاہ کر بھی اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ میں پاکستان آگیا۔ اب جب سات سال میں یہاں ڈھکے بدنوں اور جھکی نظروں میں رہا ہوں تو میری سیاہی ہلکی ہونے لگی ہے۔ مجھے اب ایک شفاف اور پاک وجود کی ضرورت ہے۔ جو اپنے لمس سے میرے وجود کی سیاحی کو مل مل کر دھو ڈالے۔ راوی اب کھڑی ہو گئی تھی۔ پانی میں چھم چھم کھیلنے لگی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس وہ چاند کی روشنی میں چاندنی سی لگتی تھی۔ چاند کا عکس پانی میں ا سکے کھیلتے وجود سے بکھرے جا رہا تھا۔ اور وہ اس کے بکھرے وجود کو اپنے ہاتھوں سمیٹنے کی خواہش میں بے چین ہوئے جا رہی تھی۔ لمبا سفید ڈوپٹہ پاگل ہوا کے ساتھ الجھ رہا تھا۔ جب وہ اس کے بہت قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا وہ لا تعلق بنی اپنے بچپنے میں مگن تھی۔ وہ اس کے اور بھی پاس آگیا۔

اب وہ اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ " راوی میرے وجود کی سیاہیوں کو اپنی پاکیزگی سے دھو ڈالو مجھے پاک کر دو " وہ یک دم اس کی طرف مڑی تھی اس نے جوگی کے چہرے پر سنجیدگی کے انبار دیکھے ہاہاہا .... ہاہاہا .... وہ ہنس رہی تھی۔ نہیں نہیں ہاہاہاہا آپ بھی ناں ہاہاہاہا وہ ہنستے ہنستے ڈھری ہوئے جا رہی تھی مگر جوگی ویسے ہی سنجیدہ کھڑا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ہنسی سے روکتے ہوئے سیدھی کھڑی ہوگئی تھی۔ " آپ ہی تو کہتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ پھر ہنسنے لگی اور پھر ہنسی کو دباتے ہوئے بولی " عادتیں اور فطرتیں بدلتی نہیں تو پھر تو پھر ہاہاہاہا آپ اپنے گناہوں کی فطرت کو کیسے بدلیں گے۔ ہاں کیسے بدلیں گے؟ " جوگی عجیب لاچار نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ تب راوی نے بہت آہستہ ہاتھوں سے ہولے سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ اب وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ " میں نیک اور پرہیز گار زندگی گزارتے گزارتے تھک گئی ہوں۔ جوگی میں اب گناہ کا جوگ لینا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی گناہ کی زندگی میں شامل کر لو۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب سے قریب آرہی تھی۔ اس کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں۔ میں تمہارا سہارا بنوں گی مگر وہیں جہاں تم اَب کھڑے ہو اپنے گناہوں کی سر زمین پر جو تمہاری اپنی ہے ہم وہاں خوش رہیں گے بہت خوش جوگی اَب اس

کی بکھری زلفوں سے کھیل رہا تھا اور راوی کی سرگوشیوں میں جذبات کی گرم جوشی بڑھ رہی تھی۔ مجھے نفرت ہے اپنی اچھائی کی فطرت سے اور تمام قسم کی حدود سے۔ میں ان سے بغاوت کرتی ہوں ہاں میں ان سے بغاوت کرتی ہوں۔ جوگی اب دھیرے دھیرے اپنی گناہ کی فطرت میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ اس پر جھکے جا رہا تھا۔ " راوی یہ بس آخری بار صرف آجری بار تمہارے کہنے پر ورنہ ورنہ وہ سرگوشیوں میں لڑکھڑانے لگا تھا۔ ورنہ .... ورنہ میں تو اپنی اس فطرت سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں راوی یک دم پیچھے ہٹ گئی تھی نہیں نہیں میری فطرت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ نہیں نہیں جوگی یہ گناہ ہے نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں کبھی بھی کوئی بڑا گناہ نہیں کر سکتی۔ یہ تو کبیرہ گناہ ہے۔ نہیں نہیں میری فطرت مجھے اس کی اجازت نہیں دیتی وہ اپنا ڈوپٹہ سیدھا کرنے لگتی تھی۔ نہیں اپنی فطرت کو دبا کر کبھی سکون حاصل نہیں کر سکتی۔ آپ ہی تو کہتے تھے۔ سر سکندر شہاب .... آپ ہی تو کہتے تھے انسان ہر کام برائی یا اچھائی اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی فطرت نہ بدل سکے تو میں کیسے بدل لوں۔ جوگی نے دیکھا راوی کے چہرے پر آنسو تھے وہ رو رہی تھی۔ " تم جانتی ہو راوی میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ارے میرا وجود تو پہلے ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ راوی مجھے ایک مسیحا کی ضرورت تھی۔ میں تو اس دلدل سے باہر آنا چاہتا تھا مگر مگر .... مگر تم نے مجھے نکالنے کی بجائے خود اس دلدل میں پھنسنے کا فیصلہ کر لیا۔

راوی روئے جا رہی تھی جب جوگی نے اسے دھیرے سے اپنے پاس بیٹھایا تھا۔ " راوی میری روح تو پہلے سے زخمی تھی۔ اس لیے صرف اسی لیے جب میں نے تمہیں دیکھا تمہاری پاکیزہ روح کو پہچانا تو چاہا کہ تم مجھے آب زم زم سے دھو ڈالو۔ مگر جب میں نے تمہاری ذات کی بغاوت کو دیکھا تو خود کو تم سے باز رکھا۔ میں اب کوئی اور گناہ اپنے کندھوں پر نہیں ڈال سکتا تھا اسی لیے جب تم مجھے کہتی کہ میں تمہیں اپنی گناہ کی زندگی میں شامل کر لوں تو مجھے تم اپنے آپ سے بہت دور کھڑی نظر آتی میں نے تم میں تمہاری آنکھوں میں لاچاری اور مظلومیت کے انبار دیکھے ہیں۔ راوی جب تم مجھ کو تمہارے خود کے وجود سے لاتعلق دیکھتی تھی۔ مگر پھر میں نے آہستہ آہستہ جانا کہ تم تو پاکیزگی اور اچھائی کے خمیر سے گندھی ہو تم کبھی چاہ کر بھی بغاوت نہیں کر سکتی تب میں نے چاہا کہ اپنے آپ کو تمہارے لمس سے دھو ڈالوں۔ تمہارے بابا اور ماں نے تمہیں نیکی کے خمیر سے پیدا کیا ہے۔ تب میں نے چاہا کہ اپنے من کی سیاہی تمہارے وجود کی پاکیزگی سے صاف کر

لوں۔ اور آج اسی سے میں نے تمہیں میرے وجود کو تمہارے وجود کی پاکیزگی میں شامل کرنے کو کہا تھا۔ مگر نہ جانے کس کمزور لمحے میں میں بہک گیا۔ آج سے پہلے نہ جانے تم نے کتنی دفع اپنے آپ کو مجھے سونپا۔ مگر تب مجھے تم میں کوئی کشش نظر نہ آتی۔ تم مجھے سراپا بغاوت نظر آتی۔ میں سکندر شہاب جو ہمیشہ انفرادی پہلوؤں کو معاشرتی اقدار پر فوقیت دیتا تھا۔ تم نے راوی تم نے مجھ میں ایک مضطرب روح کو پہچانا میرے خیالات کے Inconsistancy کو پہچانا آج میں اپنے خیالات میں بالکل واضح ہو گیا راوی۔ " انفرادی سوچ کو دبنا ہی ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار، معاشرتی رویے انفرادی سوچ کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اس کو مر ہی جانا چاہیے ورنہ وہ دھیرے دھیرے مرتے ہیں روز کبھی اپنے ضمیر کے بوجھ تلے اور کبھی معاشرتی Accepted Values تلے۔"

تم اس دنیا میں شامل ہونا چاہتی تھی جس سے میں پیچھا چھڑانا چاہتا تھا راوی نے تھکے تھکے انداز میں اپنے سر کو جوگی کے کندھوں سے ٹکا دیا تھا۔ مگر آج جب تم نے مجھے اپنی طرف بلایا تو نہ جانے کیوں لاکھ کوشش کے باوجود میں تمہارا کہا نہ روک سکا۔ " شاید میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں ہاں شاید " اور تمہیں پتا ہے محبت میں محبوب کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا جاتا۔ جوگی اب خاموش ہو گیا تھا۔

وہ نہ جانے کتنے پہر چپ چاپ ایک دوسرے سے سر ٹکاتے بیٹھے رہے تب راوی بولی " شاید مجھے اب جانا چاہیے " ہاں تمہیں اب جانا چاہیے " وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی جوگی ابھی بھی وہیں تھا راوی جا رہی تھی جوگی کو لگا وہ اب مڑ کر نہیں آئے گی۔ مگر وہ مڑی اور پھر اس کی طرف آئی تھی " شاید میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں " مگر مجھے کچھ وعدے نبھانے ہیں " ہاں تمہیں گناہ کی زندگی نہیں گزارنا راوی تم گزار نہیں سکتی۔ " میرے لیے دعا کرنا کہ میں بھی تم جیسا بن جاؤں میرے اللہ کو کہنا راوی وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ راوی اور جوگی اس بار دھاڑیں مار مار کر روئے تھے اور پھر راوی چلی گئی تھی۔

عزت نے شرجیل احمد کو فون کیا تھا " آپ فوراً خالہ بی کے ساتھ کچھ گواہوں کو لے کر آجائیں میں آپ سے جلد سے جلد نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ " شرجیل احمد آگے سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر عزت نے فون بند کر دیا۔ انتظار حسین اور ندرت بیگم حیران تھے کہ وہ یہ کیا کر رہی ہے انہوں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ ایسا مت کرے مگر وہ اپنی بات پر بضد تھی۔ شرجیل احمد اتوار کو خالہ بی کے ساتھ آیا تھا۔ خالہ بی نے شرجیل احمد کی طرف سے صفائیاں دینا چاہیں۔ مگر عزت نے انہیں ٹوک دیا؟ " خالہ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر حال میں شرجیل احمد

سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ عبد اللہ اباجان سے کہو مولوی صاحب کو لے آئیں
"ندرت بیگم روئے جا رہی تھیں مگر خالہ بی ان کو اپنے ساتھ لگائے بہن کا حق ادا کر رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد عزت عزت احمد بن گئی تھی۔ انتظار حسین نے بوجھل پڑتے وجود کے ساتھ اسے اور شرجیل احمد کو دعائیں دی اور پیار کیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد خالہ بی واپس جانے کو تیار ہو رہی تھیں۔ انہوں نے عزت کو اپنے ساتھ لگا کر بہت منہ چوما اور پھر اسے چادر اڑانے لگی تھیں۔ "عزت یہ ہماری پشتوں کی نشانی ہے۔ اس چادر کو کبھی اپنے پہلو سے جدا نہ کرنا۔ ہمارے گھر کی بہوئیں اور بیٹیاں پردہ کرتی ہیں اور پھر وہ اسے چلنے کو کہہ رہی تھیں۔ "عزت حیران کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی کس پردے اور حیا کی باتیں کر رہی تھیں وہ۔ ان کے ہاں کیا واقعہ ہی حیا اور پاکدامنی کا رواج تھا؟ ان کی باتیں عزت کو کسی لطیفے سے کم نہ لگیں "خالہ کہاں جانا ہے؟ میں تو کہیں نہیں جا رہی۔" خالہ بی اور ندرت بیگم حیران آنکھوں سے اس کو دیکھنے لگیں۔ "خالہ بی آپ کے بیٹے کو میری ضرورت نہیں جہاں آپ نے پانچ سال گزارے ہیں کچھ سال اور سہی۔ یہ نکاح اس لیے ضروری تھا کہ میں کبھی بھی معاشرے میں تماشہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے میری اَنا اور پاکدامنی سب سے پیاری ہے میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ

مجھے ترس کی نظر سے دیکھیں یا میرے کردار پر کوئی انگلی اُٹھائیں میں ایم۔فل کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں لاہور جا رہی ہوں میرا داخلہ وہاں ہو گیا ہے۔"

ندرت بیگم عزت کی باتیں سن کر ایک دفعہ پھر رونے لگیں۔ خالہ بی نے واویلا مچا دیا وہ انتظار حسین کو عزت کو سمجھانے کو کہہ رہی تھیں۔ مگر انتظار حسین چپ چاپ کھڑے رہے۔ شرجیل احمد کو پتہ چلا تو اس نے خالہ بی کو عزت کی بات ماننے کو کہا تھا اس طرح خالہ بی چپ چاپ واپس چلی گئیں۔ مگر جانے سے پہلے ندرت بیگم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ سال میں عزت کی رخصتی کر دیں۔ اور عزت نے ان سے وعدہ کر لیا تھا۔ یوں عزت لاہور آئی عزت سے " ای ذی "بن گئی اس نے لاہور آنے سے پہلے انتظار حسین کی گود میں سر رکھ کر بہت سی باتیں کیں۔ " بابا جان میں اپنے اَن جیئے سالوں کو جینا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری خلائیں اور ذات کی کمیاں بڑھتی جائیں اور میں انتظار حسین بن جاؤں۔ مجھے اپنا کھویا ہوا وقت جینا ہے اور .... اور .... اور میں گناہ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے نیکی اور پرہیز گاری سے نفرت ہو گئی ہے۔"

انتظار حسین جن کے ہاتھ اس کے بالوں پر مشفقانہ انداز میں حرکت کر رہے تھے ایک دم سے رکے تھے۔ " مجھے جانا ہے بابا۔ آپ وعدہ کریں مجھ سے آپ میرے جانے کے بعد یوں اکیلے نہیں رہیں گے۔ عبد اللہ اب جوان ہو گیا ہے وہ آپ کا سہارا بنے گا۔ لڑکیاں کبھی سہارا نہیں ہوتیں۔ بابا جان آپ کے لاکھ چاہنے کے باوجود میں ایک مضبوط درخت نہ بن سکی اور نہ ایک ذرخیز زمین۔ مجھے شر جیل احمد نے ایک پل میں بنجر کر دیا۔ مجھے لگا میں ایک مضبوط درخت ہوں۔ مگر میں تو ایک نازک کمزور بیل نکلی جس کو پھلنے پھولنے کے لیے ہمیشہ کسی دیوار کسی درخت کی ضرورت رہتی ہے۔ بابا شر جیل احمد نے مجھے باور کروایا دیا کہ میری عزت میری انا کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے ایک قدم نے میری عزت کو داغ دار کر دیا ہے۔ اگر میں اس سے نکاح نہ کرتی تو لوگ تو مجھے داغ دار قرار دے دیتے یا مجھ پر ترس کھاتے اور پھر بابا شر جیل احمد تو میرے قیمتی سالوں کا واحد سرمایہ ہے۔ یہ سب کہتے ہوئے عزت کی آنکھیں خشک تھیں۔ انتظار حسین خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ مگر جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ بولے " عزت وہ بات جو میں کہنا چاہتا ہوں بے موقع بے محل سی لگتی ہے۔ مگر بیٹا اتنا ضرور کہوں گا۔ " بیٹا میں جو تم کو مذہب کی تعلیم دیتا رہا اور وہ جو تمہاری ماں تم

کو سکھاتی رہی اس میں صرف اتنا فرق ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ اپنی عقل اپنا شعور استعمال کرنے کا سبق دیتا رہا اور تمہاری ماں کا سبق عشق کا سبق تھا۔ بیٹا منزل وہی ہے جو تمہاری ماں اور مولوی صاحب سیکھاتے رہے میں نے تمہیں راستے دکھائے۔ بیٹا میں نہیں چاہتا تھا کہ تم راستوں سے انجان رہو۔ کیونکہ موجودہ دور میں تم جیسے ہونہاروں کی ضرورت ہے تمہیں لوگوں کو راستے دکھانے ہیں۔ وہ راستے جو منزلوں تک پہنچتے ہیں۔ تم کو دلیلوں سے قائل کرنا ہے ہمارا مذہب بھی اس کی اجازت دیتا ہے کیونکہ زیادہ لوگ حقائق کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر جانتے ہیں۔ قرآن پاک میں میرا رب بار بار کہتا ہے۔

"جس نے سات آسمان بنائے تہہ بہ تہہ تو اللہ کی تخلیق میں کوئی فرق نہ دیکھے گا پھر نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا تو کوئی شگاف دیکھتا ہے؟ پھر دوبارہ نگاہ اُٹھا کر دیکھ وہ تیری طرف خوار ہو کر تھکی ماندہ لوٹ آئے گی۔)" سورہ ملک (تو بیٹا وہ تو خود بار بار کائنات کو شک کی نظر سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے کہ تم حقائق حاصل کرو۔ باخدا آج جو بغاوت میں تم میں دیکھتا ہوں وہ میرا سکھایا ہوا نہیں۔

عزت لاہور آئی تو وہ ایک بہت مختلف لڑکی بن گئی۔ عزت سے ای ذی E-Zee نے زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا۔ پہلے روز جب وہ سیاہ لمبے عبائیہ کے بغیر

گھر سے نکلی تو اسے لگا اسے کسی نے بھرے بازار میں بے آبرو کر دیا تھا۔ مگر بہت کچھ اور تبدیل ہوا تھا۔ اسے راستے میں چلتے چلتے اپنی طرف اُٹھتی اور پھر ایک ثانیے کو رکتی نظریں اچھی لگی تھیں۔ کسی کے منہ سے نکلا تعریفانہ جملہ اس کے لیے ایک انوکھا اور پر مسرت تجربہ ہوتا۔ اس کے لب گلوز میں شامل اس کے دوستوں کا بچپنا اس کو فرحت بخشتا واقع ہی عزت اپنا اَن جیا وقت جینے لگی تھی۔
اور پھر سکندر شہاب ان کی پیرکشش شخصیت اور میچور سوچ نے اس کو ان کی طرف مائل کیا تھا۔ اس دن ان کے فیکلٹی روم میں بلانے پر جب وہ گئی تو انہوں نے اسے سمجھایا کہ ہمیں اپنی ایسی سوچیں جو دوسروں پر منفی اثرات ڈالیں اور ان کے عقائد کو خراب کریں۔ کھلے عام نہیں کہنا چاہیں اور یہ کہ وہ بھی حالات سے نظریں چرانے کو گناہ سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی خود کی فطرت پر قابو نہیں پا سکتے۔ اس لیے ایسی کمزور دلیلوں کو استعمال کرکے اپنے آپ کو مطمئن رکھتے ہیں حقیقت بہت سادہ ہے جو وہ کلاس روم میں بتا چکے ہیں۔ اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ملنے لگے تھے اور پھر انہوں نے بہت سے لمحات اکٹھے جیے۔ راوی کے کنارے شہر سے باہر ویران سڑکوں پر، شہر کے بیچوں بیچ پلوں پر، پارکوں میں کشمیر، سوات، قلاش جیسے پر فضا خاموش علاقوں میں، پر ہجوم علاقوں میں ہر جگہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

انہوں نے ایک دوسرے میں یکسانیت کے رنگ تلاش کیے اور پورے ڈیڑھ سال اور عزت خریم احمد بن گئی۔ وہ کتنے چہرے بدلتی گئی تھی۔ عزت، عزت احمد، ای ذی، راوی اور اب خریم احمد یہ نام اسے شرجیل احمد نے اپنی مرحوم بیوی اور محبوبہ کی یاد میں دیا تھا۔ برکت بی بی کہتی تھی۔ وہ مر رہی ہے مگر وہ تو جوگی کو کتنی بار کہہ چکی تھی کہ وہ مر گئی ہے۔
خالہ بی کو برکت بی بی کی بات کی سچائی واضح نظر آنے لگی تھی خریم کی حالت روز بروز خراب ہوئے جا رہی تھی وہ اکثر بیٹھے بیٹھے ایسی کھو سی جاتی کہ کسی کے لاکھ بلانے پر بھی اسے ہوش نہ آتا برکت بی بی کے جانے کے بعد وہ پھر سے خاموش ہو گئی تھی۔ شرجیل اسے کئی بار ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ مگر ساری رپورٹس صحیح آتیں۔ مگر پھر نہ جانے کیوں وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنسنے لگی تھیں۔
شرجیل احمد کو نہ جانے اس کی فکر تھی یا اپنے ہونے والے بچے کی وہ اب روز شام پانچ بج گھر آجاتا اور پھر خریم کو ساتھ لے کر کسی پارک یا ریسٹورنٹ میں لے جاتا ان اوقات میں خریم قدرے بہتر نظر آتی۔ شرجیل احمد کے رویے میں واضح تبدیلی ائی تھی وہ اب گھنٹوں اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جس کے جواب میں

خریم زیادہ تر خاموش ہی رہتی مگر کبھی کبھا وہ اچانک ہی اونچی اونچی ہنسنے لگتی۔ اور پھر شرجیل احمد کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔ " شرجیل آپ جانتے ہیں ناں کہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں جانتے ہیں ناں آپ؟ اس جملے کو کہتے ہوئے خریم کی آواز میں تھکن مجبوریوں اور بے کسیوں کے سارے لے رنگ در آتے۔ شرجیل احمد حیران تھا کہ خریم کو بیٹھے بیٹھے یہ اچانک کیا ہو جاتا ہے وہ جو کئی کئی گھنٹے چپ چاپ بغیر کچھ بولے بیٹھی رہتی تھی اچانک یہ کیوں پوچھنے لگتی ہے اور پھر وہ کہتا "ہاں مجھے معلوم ہے میری بیوی بہت وفا شعار ہے۔ نیک بیوی اللہ تعالیٰ کا تحفہ ہوتی ہے۔اور خریم ننھے بچے کی طرح من پسند چیز ملنے پر پر سکون انداز میں اپنے ارد گرد پڑی چیزوں کو اپنائیت سے دیکھنے لگتی۔ یہ گھر جہاں شرجیل احمد رہتا تھا۔ اس گھر کی ساری چیزیں خزیم کی تھیں وہ بہت مطمئن انداز میں کہتی " شرجیل احمد ہم اس گھر کو ہمیشہ آباد رکھیں گے۔ آپ کی وفاشعار بیوی آپ کو کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ نہیں دے گی۔ " اور تب اچانک کوئی وجود اس سے ٹکراتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کرتا " تمھیں گناہ کی زندگی نہیں گزارنی تم گزار ہی نہیں سکتی ہاہاہا........... ہاہاہا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

وہ وجود کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا شرجیل احمد سے شادی کے بعد وہ روز بلاناغہ کچھ دیر اس کے پاس آکر ضرور بیٹھتا تھا تب خریم چپکے چپکے اس سے باتیں کرتی راوی کے پاس گزاری شاموں اور خالی سڑکوں کے گرد کھڑے دیوہیکل درختوں پر بیٹھے پرندوں کی یادیں تازہ کرتی صرف یادیں تو رہ گئیں تھیں ان لمحات کی جس میں وہ صرف یادیں تو رہ گئیں تھیں ان لمحات کی جس میں وہ اصل میں جی اُٹھی تھی اور پھر جب شام گہری ہونے لگتی تو وہ اس کو جانے کو کہتی وہ کہتی "جوگی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں ہمیں یوں نہیں ملنا چاہیے اور اب تو شام ہو رہی ہے یہ ناں ہو کہ یہ جو آسمان پر پرندے اپنے گھروں کو لوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ہم دونوں میں بھی فراق کی امید پیدا کر دیں اور تب وہ ہنسنے لگتا " تمھیں گناہ کی زندگی نہیں گزارنی تم گزار ہی نہیں سکتی۔ تمہاری فطرت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی ہاہاہا۔

خریم کا ساتواں مہینہ چل رہا تھا اور اب آئے روز ہی اس کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس کے ذہن پر بہت بوجھ ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے شرجیل احمد بہت پریشان ہو گیا تھا اس کے اتنا خیال رکھنے کے باوجود خریم کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ خالہ بی کہتی تھیں کہ یہ اس کے چپ چاپ رہنے کی وجہ

سے ہے۔ اگر وہ بولے، کھیلے ہنسے تو ایسا نہ ہو۔ شرجیل احمد نے بہت کوشش کی کہ خریم ہنسنے بولنے لگے چھ ماہ سے وہ بلاناغہ اس کے ساتھ صبح سیر کو جاتا۔شام کو پانچ بجے آجاتا اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتا۔ مگر خریم پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ اس سے بیڈ روم میں بیٹھے ہلکی پھلکی باتیں کر رہا تھا۔ "تمہیں پتہ ہے خریم یہ بچہ میرے لیے بہت اہم ہے بہت اہم۔ پہلے پہل جب اماں مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتیں تو مجھے کسی قسم کا کوئی احساس ناہوتا تھا مگر اب جب ہماری ننھی سی جان ہمارے وجود کا حصہ اس دنیا میں آنے والا ہے تو مجھ سے انتظار ہی نہیں کیا جا رہا۔ میں بہت بے چین ہوتا جا رہا ہوں صرف ڈیڑھ دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ خریم شرجیل احمد کے سامنے بیڈ پر بیٹھی اپنی چوڑیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ "تم خوش ہو ناں خریم" ؟ "ہمارے بچے سے خوش ہو ناں"

"نہیں " میں خوش نہیں ہوں خریم شرجیل احمد کا بازو زور سے پکڑے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔ میں اس بچے سے خوش نہیں۔ شرجیل احمد یہ بچہ جائز نہیں ہے۔ یہ ناجائز اولاد ہے۔ شرجیل احمد بے یقینی کی کیفیت میں اس کے غصے سے بھرے وجود کو دیکھ رہا تھا یہ بچہ نفرتوں کے تیزاب سے

پیدا ہوا ہے۔ اس میں محبت کا خمیر شامل نہیں یہ ناجائز ہے شرجیل احمد نے زور دار تمانچہ اس کے چہرے پر رسید کیا تھا اور وہ بیڈ سے گر گئی تھی۔ زور دار اور ناقابل برداشت درد سے وہ چیخ اٹھی تھی۔ " مجھے بچاؤ بابا مجھے بچاؤ میں مر رہی ہوں مجھے بچاؤ۔" شرجیل احمد نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے تھاما تھا۔ خالہ بی بھی آگئی تھیں۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے آکسیجن لگا دی تھی اسے سانس نہیں آرہا تھا۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ معاملہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ صرف دعا ہی کام کر سکتی ہے۔ خالہ بی نے فوراً عبد اللہ کو فون کیا تھا عبداللہ آجکل اپنی بیوی کے ساتھ کراچی ہوتا تھا۔ ندرت بیگم اور انتظار حسین کی موت یکے بعد دیگرے تب ہی ہو گئی تھی جب عزت نکاح کیبعد عزت احمد ہو گئی اور لاہور چلی گئی اور وہ اپنی اولاد کا دکھ برداشت نہ کر سکے عبد اللہ کی شادی وہ اپنی حیاتی میں ہی کر گئے۔ عزت کا کہنا تھا کہ شرجیل احمد اس کے ماں باپ کا قاتل ہے وہ مرے نہیں تھے قتل کیے گئے تھے۔ عبداللہ فون سن کر فوراً وہاں سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر حبیب نے کہا تھا " ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں بچے کو فوراً گرانا ہو گا۔ ورنہ ماں کی زندگی کو خطرہ ہے۔"

شرجیل احمد بہت رویا تھا اس روز۔ خالہ بی کے گلے لگے وہ بہت بلک بلک کر رویا تھا۔ خریم کو پندرہ بیس دن کے بعد ہسپتال سے چھٹی دی گئی تھی۔ اس دوران عبداللہ لاہور ہی رہا تھا۔ وہ صبح شام اس کے سرہانے بیٹھا رہتا خالہ بی اور شرجیل تو اسی روز واپس گھر چلے گئے تھے۔ جب بچہ گرایا گیا تھا جس دن خریم کو چھٹی ملی تو ہسپتال سے باہر آتے ہوئے خریم سوچ رہی تھی اب وہ کہاں جائے گی۔ " سرسکندر شہاب کتنا آسان تھا ان کے پاس جانا جیسے کوئی تھکا ماندہ شخص طویل مسافت کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ تو بہت سی منتظر نگاہیں اس کا طواف کرتی ہیں اسے یقین تھا کہ جوگی کی نگاہیں راوی کے دھانے بیٹھی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ "کہاں جانا ہے آپی؟ " عبداللہ پوچھ رہا تھا۔ شرجیل بھائی کو میں نے بہت فون کیے مگر وہ میرا فون اٹھا ہی نہیں رہے 'ہاں' خریم چونکی تھی۔ " وہ مصروف ہوں گے گھر ہی جانا ہے۔ " خریم نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ اور یہ کہتے ہوئے اسے ایک بار پھر راوی کا کنارہ یاد آیا تھا۔ عبد اللہ نے کسی ٹیکسی والے کو آواز دی تھی اب وہ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اسے اپنے اور اپنے بچوں کے بارے

میں بتا رہا تھا اور خریم ہلکے پھلکے انداز میں اس کے جواب دے رہی تھی ٹیکسی شرجیل احمد کے گھر کے سامنے کھڑی تھی اور تب خریم نے اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے گھر کے گیٹ کے اندر داخل کیا تھا۔ عبداللہ بھی اندر آگیا تھا لان میں انگوروں کی بیل پر پھر پتے جھڑ گئے تھے۔ خزاں آگئی تھی۔ پھر وہ جب خالہ بی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں وہ عبداللہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ عبداللہ کچھ دیر بیٹھا تھا اور پھر ساہیوال کا چکر لگانے کا کہہ کر چلا گیا تھا ان کا پرانا گھر ابھی بکا نہیں تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں ہی رہی خالہ بی کو معلوم تھا کہ وہ آئی ہوئی ہے مگر وہ اس کے پاس نہ آئیں۔ ناز نین کچھ دیر آکر بیٹھی تھی۔ مگر اس سے کھانے پینے کا کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اور پھر چلی گئی تھی۔ شام کو شرجیل احمد آیا تو خریم کو کمرے میں پاکر فوراً آگ بگولا ہو گیا۔ " تم یہاں پر کیوں آئی ہو کیا تعلق ہے تمہارا میرے ساتھ۔ ہاں بتاؤ کیا تعلق ہے۔ نفرت کا ناں تم میرے اور اپنے رشتے کو ناجائز سمجھتی ہو۔ میرا اللہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا ورنہ میں تو جان گیا ہوں کہ تم پڑھائی کی آڑ میں یونیورسٹی میں بہت جائز تعلقات پیدا کرکے آئی ہوں۔ ورنہ پہلے تو ایسی نہ تھی۔ خریم کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔ وہ لرزتے لرزتے ہچکیوں کے بیچ روئے جا رہی تھی۔ اگر ہمارا تعلق ناجائز ہے

تو مجھے بتاؤ تمہارے کس کے ساتھ تعلقات جائز تھے جن کو تم بھول نہیں پائی۔ خریم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کی مضبوط گرفت سے اپنے بازوؤں کو چھڑایا۔ " ہاں ہاں میں نہیں بھول پائی نہیں بھول پائی اسی طرح جس طرح آپ نہیں بھول پائے اپنی پہلی بیوی کو۔ ارے میں تو دن رات نیکی اور بدی کے تصور میں گھلتی رہی اپنے آپ کو روکتی رہی اپنے نفس کے خلاف جنگ کرتی رہی کہ اس شخص کی سوچ کو بھی اپنے دماغ سے دور رکھوں کہ یہ گناہ ہے یہ آپ کے ساتھ نا انصافی ہو گئی مگر آپ .... آپ شرجیل احمد آپ نے اسلام اور مذہب کی اتنی مہریں اپنے وجود پر ثبت کرنے کے باوجود طلاق کے بعد کسی تعلق کے اپنی گزشتہ بیوی کے ساتھ دو سال رہتے رہے اس سے اپنی اولاد پید اکی اور پھر آپ کی غیرت اور شرم یہ ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو اس کالے بازار میں لوگوں کے منہ کا نوالہ بننے کے لیے چھوڑ دیا۔" شرجیل احمد نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ایک زور دار چماٹہ رسید کیا تھا۔ مگر اس بار خریم خاموش نہیں ہوئی تھی۔ " شرجیل احمد میرا خدا جانتا ہے اس سب کے باوجود جو آپ نے میرے ساتھ کیا میں نے اپنے خیالات کو بھی آپ کی امانت سمجھا۔ میں نے دن رات اپنے نفس کے خلاف جنگ لڑی مگر ایک انسان ہونے کے ناطے جب کبھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ پر قابو کھو بیٹھتی تو وہ میرے پاس ایک الوژن کی صورت آبیٹھا اور تم جانتے ہو وہ مجھ سے کیا کہتا۔ " تم گناہ کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ عزت تم گزار ہی نہیں سکتی وہ میرے ارادے کو پھر سے مضبوط کر دیتا اور میں پھر سے نفس کے خلاف جنگ پر کمر بستہ ہو جاتی ان تین سالوں میں میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور پیچھے مڑوں بھی تو کس کی طرف ان ڈیڑھ سالوں کی طرف جو ایک خواب کی طرح گزر گئے۔ ہمارے درمیان کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں تھا شرجیل احمد۔ بس ہم اپنی محرومیوں کو دور کرتے رہے۔ ان ڈیڑھ سالوں میں۔ اور جب ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک دوسرے میں انوولو ہو رہے ہیں تو ہم جدا ہو گئے۔

شرجیل احمد میرے پاس پیچھے مڑنے کے لیے ان ڈیڑھ برسوں سے زیادہ وہ عرصہ زیادہ اہم ہے۔ جو میں نے تمہارے سہارا گزارا۔ وہ عرصہ۔ وہ عرصہ جب میں نے دنیا سے نظریں چرائے تمہارے پہلو میں جنت تلاش کی۔ وہ پانچ سال۔ شرجیل احمد تم میرے قیمتی سالوں کا واحد سرمایہ ہو۔ شرجیل احمد فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور خریم اپنے وجود کو پھر سے سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ شرجیل احمد دو دن بعد گھر واپس آیا تھا۔ خالہ بی بہت پریشان تھی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے اس کا

موبائل بھی بند آرہا تھا جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک چار، پانچ سالہ لڑکی تھی اور وہ شرجیل احمد کو بابا کہہ رہی تھی۔ خالہ بی نے اسے بہت پیار کیا تھا۔ اس بچی کو شرجیل احمد جب کمرے میں لایا تو خریم سو رہی تھی۔ شرجیل احمد نے اسے پکڑ کر اٹھا دیا تھا کہ یہ ہماری بیٹی ہے۔ میری اور خریم کی خریم میری پہلی بیوی۔ خریم نے شرجیل احمد کے عکس کو اس بچی کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ اب یہاں رہے گی میرے ساتھ اس گھر میں وہ بچی کچھ دیر وہاں کھڑی رہی اور پھر باہر چلی گئی خریم گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ جب شرجیل احمد پھر گویا ہوا۔ ” خریم تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ میری خوش کو مجھ سے چھین لیا۔ میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر دیا وہ اب بلک بلک کر روہ رہا تھا۔ کتنا عجیب ہوتا ہے انسان کسی دوسرے کی زندگی بھر کی خوشیاں چھین کر اس کو بنجر کر دیا۔ مگر آپ اپنے آپ کو ملنے والے ایک غم کو سہہ نہیں سکتا۔ ” خریم میرے بابا کے بعد میں بہت اکیلا ہو گیا تھا اور پھر خریم چلی گئی۔ تمہاری طرف سے بھی مجھے کوئی خوشی نہ ملی یا میں خود ہی تم سے کوئی خوشی حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ان حالات میں یہ بچہ میرے لیے واحد مسرت کی امید بن کر آیا تو تم نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ خریم پر اچانک سے وہی جنون طاری ہو گیا۔ وہ شرجیل احمد کو اس طرح روتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔
www.pakistanipoint.com

ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے اس کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں بھر لیا۔ شرجیل احمد مت رو پلیز مت رو میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تم جیسا چاہو گے ویسا ہی ہو گا۔ میں اپنی عمر بھر کی پونجی کو آنسوؤں میں بہتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ شرجیل احمد ایک دفعہ پر حیران ہوئے جا رہا تھا ایسی حالت میں خریم اس کو اپنی روح کے قریب کھڑی نظر آتی تھی۔ شرجیل احمد میں نے واقعی ہی بہت برا کیا۔ ایک وفا شعار بیوی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کبھی بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شرجیل احمد جانتا تھا۔ خریم کی حالت ایک وقتی کیفیت ہے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو وہ ویسے ہی گم صم ہو جاتی پہلے کی طرح۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس چپ کے دوران وہ اپنے نفس سے جنگ کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو پاک کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اور جب شرجیل احمد کو اس کی بہت ضرورت ہوتی تو وہ لبیک کی آواز کے ساتھ بول اٹھتی۔ ” آپ جانتے ہیں نہ آپ کی بیوی آپ سے بہت محبت کرتی ہے جانتے ہیں ہاں ناں آپ؟“

شرجیل احمد خریم کے شانے پر سر رکھ کر بہت رویا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ” تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ خریم بہت برا کیا۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لیا وہ بہت دیر تک شرجیل کے کمزور وجود کو اپنی جھولی میں لیے تھپکتی رہی اور پھر رہی اور پھر شرجیل احمد چلا گیا تھا اور وہ اب دیوہیکل آئینے کے سامنے کھڑی اپنے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ دو تین دن سے جس دن سے شرجیل احمد اس سے لڑائی کے بعد گھر سے گیا تھا اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اس کا وجود کمزور تر ہو گیا تھا۔

وہ پچھلے تین سال سے رات کو جب شرجیل احمد سو جاتا تو اس آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس میں اپنی شناخت تلاش کرنے کی کوشش کرتی تو اسے اپنا آپ بہت بے بس اور مظلوم محسوس ہوتا۔ یہ وہ لمحے تھے جب وہ کچھ دیر کے لیے اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیتی تو اس کو اپنے آپ پر ترس آتا۔ دل کرتا کہ اپنے آپ کو اپنی ہی جھولی میں رکھ کر بہت پیار کرے۔ تب وہ آئینہ بھی اس کے رستے وجود کی ساری کہانیاں بہت دکھی دل سے سنتا مگر آج وہ آئینہ اس کے خلاف بول رہا تھا اسے لگا وہ کہہ رہا ہو۔ ” تم مجبور اور بے بس نہیں ہو تم نے شرجیل احمد کو وقت کی چکی پسنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تم نے چاہا کہ اس کی چکی میں پسنے والے دانے کبھی کم ناں ہوں۔ اسے دن رات کے کاموں میں الجھا دیا۔ تم نے جوگی کو

کہا تھا آجکل سب لوگ مرے ہوئے ہیں وہ دن سے رات اور رات سے دن ایک جیسے کاموں میں غرق رہتے ہیں۔ وہ وقت کو ایسے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کو چکی چلتی ہے۔ ایک طرح سے گھومتی ہے۔ ایک ہی مرکز کے گرد تم نے چاہا کہ شرجیل احمد بھی اس چکی کو پیسے اور اس کے دانے کبھی کم ناں ہوں تم نے اس کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے دن رات کی مسافت میں الجھا دیا .... نہیں نہیں میں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا اللہ گواہ ہے میں تو چاہتی تھی۔ شرجیل احمد مجھ سے دور رہے گا۔ تو میں جلد اپنے آپ کو پرانی جی ہوئی زندگی سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گی نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میری نیت صاف تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ شرجیل احمد میرے پاس آئے تو ہماری محبتوں میں بیگانے رنگ شامل ہوں اور پھر شرجیل احمد نے خود کبھی مجھے اپنی چاہتوں میں شامل نہیں کیا۔ مگر آئینہ ہنس رہا تھا۔ اس پر وہ دھڑام سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

میری نیت صاف تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ شرجیل احمد میرے پاس آئے تو ہماری محبتوں میں بیگانے رنگ شامل ہوں اور پھر شرجیل احمد نے خود کبھی مجھے اپنی چاہتوں میں شامل نہیں کیا۔ مگر آئینہ ہنس رہا تھا۔ اس پر وہ دھڑام سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

شرجیل احمد نے اگلے ہی روز خریم کو عزت بنا ڈالا اور اسے طلاق دے دی۔ اسے کہا خریم میں نہیں سمجھتا کہ ہمار درمیان کچھ ایسا ہے جو ہمیں باندھ سکے اور یہ بھی کہ میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے نفس کی جنگ کبھی ختم ہو گئی۔ تم کبھی بھی اپنے ماضی کو خود سے جدا نہیں کر سکتی ہو۔ عزت چاپ چاپ بغیر کوئی لفظ بولے وہاں سے نکل آئی تھی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایسا کچھ اس نے پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ بھرے بازار بے لباس ہو گئی ہے ہاں تب بھی شرجیل احمد کی وجہ سے وہ زندگی کے اس موڑ پر آکھڑی ہوئی تھی جہاں راستے بہت تنگ ہو گئے تھے۔ تب شرجیل احمد نے اس کی پشت پر خنجر گھونپا تھا۔ مگر وہ بچ نکلی تھی۔ شرجیل احمد نے تب اسے زندہ پا کر اس سے معذرت کر لی تھی کہ ایسا اس سے بے خبری میں ہوا ہے۔ اور پھر پورے تین سال بعد اس نے موقع پاتے ہی اسے مار ڈالا تھا۔ اوراس دفعہ اس نے پشت کی بجائے سامنے وار کیا تھا۔ وہ اب اپنی لاش کو اٹھائے پیدل چلی جا رہی تھی کئی راستے بدلے کئی سڑکیں ختم ہوئیں مگر اس کی منزل آہی نہیں رہی تھی۔ جہاں اس نے اپنی لاش کو دفن کرنا تھا۔ صبح سے دوپہر اور پھر شام وہ راوی کے کنارے کھڑی بغیر کسی تھکاوٹ کے ارد گرد سے بے نیاز یہاں تک پہنچی تھی مگر اب جب فاصلہ کچھ قدموں کا رہ گیا تھا۔

تو اس کے پاؤں جواب دینے لگے تھکن نے اس کے وجود کو چور چور کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے بچپن میں چوٹ لگنے سے بچہ ہولے ہولے آنہیں بھرتا ہے تکلیف برداشت کرتا ہے مگر ماں کو سامنے دیکھ کر اس کے درد کا احساس بڑھ جاتا ہے وہ رونے لگتا ہے۔ عزت بھی رونے لگی تھی اور واقع ہی جوگی وہیں بیٹھا تھا۔ آلتی پالتی مارے جھنڈوں کے بیچوں بیچ مگر ایک چیز جو خواب مختلف تھی وہ یہ تھی کہ وہ اب یوگا نہیں کر رہا تھا۔ تسبیح ہاتھ میں پکڑے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ عزت تھکے قدموں سے چلتے اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔ جوگی نے آنکھیں کھولی تھیں " تو تم آگئیں " " میں آگئی " وہ چپ چاپ کچھ دیر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھے رہے۔ اور پھر عزت گویا ہوئی "کیا ہو رہا ہے آجکل " "بس معمول کے کام " جوگی بولا۔ " خوش ہو " عزت نے اگلا سوال کیا تھا " بہت خوش تمہیں پتہ ہے مجھے یقین تھا کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہو گی۔" اللہ نے تمہاری دُعا قبول کرلی اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ عزت ابھی بھی سامنے انجانی چیز کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور تم نے شادی نہیں کی۔ نہیں مجھے اب ضرورت نہیں راوی میرا اللہ میرے لیے کافی ہے میرے من کی سیاہی کو اس نے خود ہی دھو ڈالا۔ مجھے اب شادی نہیں کرنی۔ " عزت نے اچانک منہ پھیر کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے اپنے

سے بہت دور کھڑا نظر آیا۔ نیک پرہیز گار جھکی ہوئی نگاہیں " اور تم .... تم خوش ہو؟ " عزت خاموش رہی جب وہ خود ہی بولا تھا۔ " یقیناً تم خوش ہو گی۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو کبھی زیادہ دیر تک ناخوش نہیں رکھتا۔ شرجیل احمد بہت خوش نصیب ہے جس کو تم جیسی وفا شعار بیوی ملی۔ " اب کہ عزت اچانک وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ " اندھیرا ہو رہا ہے مجھے چلنا چاہیے۔ " ہاں تمہیں چلنا چاہیے "مگر ایک بات ہے عزت وہ جو کبھی میرے اور تمہارے لیے راوی ٹھاٹھیں مارتی تھی وہ میرے خدا کی دی ہوئی عقل کا کرشمہ ناں تھا تو کیا تھا۔ عزت جب وہاں سے نکلی تو اسے اپنے پورے وجود سے بدبو آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ تو غلاظت کا ڈھیر تھی۔ اور جوگی اسے نیک روح سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی میں نے نیکی کا خمیر اپنے ورثے میں حاصل کیا اور پھر بھی نیک نہ رہ سکی۔ ڈیڑھ سال تک بے حجاب سڑکوں پر کسی اجنبی کے ساتھ پھرتی رہی۔ اور پھر شادی کی تو اپنے شوہر کے ساتھ منافقت کرتی رہی۔ اپنے خیالوں کو ایک نامحرم کے پاس گروی رکھ دیا میں نے اور میرا نفس ایسا کمزور نکلا کہ ان خیالوں کو اس سے کبھی آزاد نہ کر سکی بابا کہتے تھے میں نے ان کے خیالات کو بغاوت سمجھا اور میں پوری زندگی بغاوت کرتی رہی۔ بدبو بہت تیز ہو گئی تھی۔ میں کچڑے کا ڈھیر ہوں۔ آج جب شرجیل

احمد نے مجھے طلاق دی تو میرے قدم اسی نامحرم کی طرف اٹھے مگر وہ جو برائی کی فطرت اور نامناسب حالات میں گندھا ہوا تھا اللہ نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ تو عزت بیگم تم کچرا ہو کچرے کے ڈھیر میں شامل ہو جاؤ سڑک پر بکھرے بالوں اور بے ڈھنگے انداز میں لٹکے ڈوبٹے کو دیکھ کر بہت سی ذو معنی نگاہیں اس کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ " چلو گی حسینہ دس ہزار دوں گا۔ " کوئی موٹر سائیکل سوار اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور حسینہ چپ چاپ اپنے آپ کو نیا چہرہ نیا نام دینے والے کو دیکھتی رہ گئی۔ " تم کچرہ ہو کچرے کے ڈھیر میں شامل ہو جاؤ " .... تم گناہ کی زندگی نہیں گزار سکتی تمہاری فطرت تمہیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتی " .... تم کچرہ کا ڈھیر ہو کچرے میں شامل ہو جاؤ .... تم پاکیزگی کے خمیر سے گندھی ہوئی ہو .... تم منافق ہو باغی ہو بدکردار ہو۔ ایک تیز رفتار گاڑی عزت کے وجود سے ٹکرائی تھی .... تمہاری فطرت اس کی تمہیں اجازت نہیں دیتی قدرت نے عزت کے کھوکھلے وجود کو اپنی جھولی میں بھر لیا تھا اور ایک لاش سڑک کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ انفرادی سوچ کو مرنا ہی ہوتا ہے اپنے ضمیر کے بوجھ سے یا معاشرتی Accepted Values کے دباؤ سے۔مگر قدرت نے عزت کی انفرادی سوچ کو بھی پنا دی تھی موت کی آغوش میں شرجیل احمد کی دی ہوئی نفسیاتی موت

کا فیصلہ اس معاشرے میں ممکن نہیں تھا اس لیے وہ اپنا فیصلہ لینے بڑی عدالت میں چلی گئی تھی۔

(ختم شد)